

چھوٹی بہن کا پگلا بھائی
حقیقی زندگی کی سولہ ڈرامائی اور سچی کہانیاں
عنایات اللہ

چھوٹی بہن کا پگلا بھائی

حقیقی زندگی کی سولہ ڈرامائی اور سچی کہانیاں

عنایت اللہ

فہرست

پیش لفظ

سترہ کہانیوں کا یہ مجموعہ پیش کیا جا رہا ہے جس کے مصنّف اتنے ہی ہیں جتنی کہانیاں ہیں۔ ان میں دو تین کہانیاں ترجمہ کی گئی ہیں۔ باقی سب مصنفین کے ذاتی تجربات اور مشاہدات ہیں۔ اس طرح ہر کہانی سچی ہے اور ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ ہر کہانی میں آپ اتنی دلچسپی محسوس کریں گے کہ ایک بار پڑھ کر آپ کی تسکین نہیں ہوگی۔

ان کہانیوں کا موضوع، پس منظر اور ماحول ایک جیسا نہیں۔ آپ ایک کہانی بلکہ آپ بیتی پڑھ رہے ہیں جو سمندر میں ڈوب رہی ہے، ڈوب ڈوب کر اُبھر رہی ہے اور جب آپ اگلی کہانی پر آتے ہیں تو اپنے آپ کو کسی کے گھر کی چار دیواری میں یا جنگل یا صحرا میں یا معاشرے میں پاتے ہیں۔ اس طرح سترہ کہانیوں کا یہ مجموعہ وہ کھلونا بن گیا ہے جو بچے آنکھ کے آگے رکھتے اور آہستہ آہستہ گھماتے ہیں تو انہیں رنگدار پھولوں کی شکلیں بدلتی نظر آتی ہیں۔ اس کھلونے کو KALEIDOSCOPE کہتے ہیں۔ اسی دلچسپی کو مدِّنظر رکھتے ہوئے ہم نے یہ مجموعہ ترتیب دیا ہے جس میں آپ کو اس دنیا کے اور انسان کی فطرت کے کئی رنگ نظر آئیں گے۔ آپ ہر کہانی میں ان رنگوں کو بدلتے اور مختلف شکلیں اختیار کرتے دیکھیں گے۔

کہانی آج کے ہر فرد کی فطری ضرورت ہے۔ داستان گوئی ایک قدیم فن ہے جو بھکاری کو بھی اتنا ہی عزیز رہا ہے جتنا بادشاہ کو۔ داستان من گھڑت ہو یا حقیقی، اعصابی تھکن کے لیے اکسیر کا اثر رکھتی ہے۔ آج تفکّرات نے زمانے کی بدلی ہوئی چال اور بڑھتی ہوئی رفتار اور نئے دور کے مسائل نے افراد کے

اعصاب کو توڑ ڈالا ہے۔ افراد اعصابی تسکین چاہتے ہیں۔ یہیں سے فحش اور اخلاق سوز کہانیوں اور فلم بینی نے فروغ پایا۔ لوگوں کی داستان پسندی جیسی کمزوری اور ضرورت کے پیش نظر زرپرست قلمکاروں اور ناشروں نے من گھڑت کہانیاں پیش کیں جن سے ایمان اور اخلاق نے بہت برا اثر لیا۔

مکتبہ داستان نے لوگوں کی یہی ضرورت پوری کی لیکن ایسی کہانیاں پیش کیں جنہوں نے ایمان کو خراب کرنے کی بجائے ایمان کو پختہ کیا۔ دلچسپی برقرار رکھتے ہوئے پڑھنے والوں کو صحت مند سوچوں کا مواد دیا۔ مکتبہ داستان کی کتابوں کی فہرست دیکھ لیجئے۔ یہ ہمارا مشن ہے۔

یہ مجموعہ پڑھیں، گھر کے ہر فرد کو پڑھائیں، پھر ہمیں بتائیں کہ ہم اپنے دعوے میں کہاں تک حق بجانب ہیں۔

عنایت اللہ

مدیر ماہنامہ "حکایت" لاہور

بٹ ڈوری کے شیر مہاراجہ کے ڈوگرے

نام اُس کا خان زمان ہے، لوگ اسے خانُو کہتے ہیں۔ اس کا دعویٰ ہے کہ اس کی عمر سو سال سے اوپر ہے۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر نوّے اور سو سال کے درمیان ہے۔ اگر وہ سو سال سے اوپر کا ہی ہے تو یہ کوئی عجوبہ نہیں، وہ کشمیر کے اُس علاقے کا رہنے والا ہے جہاں برف پڑتی ہے۔ وہاں کے لوگوں کی عمریں عموماً لمبی ہوتی ہیں۔ خانُو کسی شہر میں نہیں چھوٹے سے ایک گاؤں میں رہتا تھا جو بلندی پر واقع ہے۔ اس کی بیوی کو مرے چھ سات سال گزر گئے ہیں۔ اس کے چھ بیٹے ہیں جن میں سے چار زندہ ہیں۔ اِن بیٹوں کے بھی بیٹے اور بیٹیاں ہیں اور ان کے بھی بیٹے اور بیٹیاں ہیں۔ ان میں سے بعض انگلستان میں ہیں۔ وہ تین نسلوں کا بزرگ ہے۔ اِن نسلوں کے افراد دُور دُور بکھر گئے ہیں، سمندر پار بھی چلے گئے ہیں لیکن خانُو کو ان کی تعداد یاد ہے جو میں نے پوچھی تو اس نے ذہن پر زور دیتے بغیر کہا — "بیاسی" — اُسے یہ بھی یاد ہے کہ اس کی کون سی نسل کا کون سا کنبہ کہاں ہے۔ اُسے ان سب کے ساتھ گہرا دلی لگاؤ ہے اور وہ سب اس کا احترام کرتے ہیں جس کا اظہار وہ لوگ خطوں میں کرتے رہتے ہیں۔

"یہی میری لمبی عمر کا راز ہے" — میرے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے اُس نے کہا — "پیار، ہر کسی سے، ہر انسان کے ساتھ محبت، خلوص۔ دل میں کدورت نہ رکھنا۔ آج کل میں نے دیکھا ہے کہ باپ بیٹا ایک دوسرے کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ میں نے اپنے خاندان میں کدورت نہیں آنے دی۔ میری تیسری

نسل کے بچے بھی میرے پاس اس طرح آتے ہیں جس طرح لوگ کسی پیر کے پاس جاتے ہیں۔"

"سادہ غذا اور کشمیر جیسی آب و ہوا بھی تو عمر کو دراز کرتی ہے" —— میں نے کہا۔

"میں نے کشمیر میں کتنے لوگوں کو پچاس سال کی عمر میں بوڑھے ہو کر مرتے دیکھا ہے" —— اُس نے کہا —— "صرف وہ غذا عمر کو لمبا کرتی ہے جو تم دل کو دیتے ہو۔ اگر دل کو غصہ اور کدورت کھلاتے رہو تو جسم اچھی غذا کے باوجود پچاس سال سے پہلے ہی اتنا بوڑھا ہو جاتے گا جتنا میں سو سال میں بھی نہیں ہُوا۔ ۱۹۴۷ء میں جب، سمجھ لو، میری عمر ستر بہتر سال تھی میرا بڑھاپا شروع ہُوا تھا۔ ایک یہ غم دل کو لگ گیا ہے کہ میں وطن سے نکالا گیا اور میرے وطن پر کافروں کی بادشاہی ہے۔ دوسرا غم یہ ہے کہ لوگوں میں پیار اور خلوص نہیں رہا۔ یہ ملک مسلمانوں کا ہے مگر مسلمانوں کو گناہوں سے محبت ہو گئی ہے۔ میں پاکستانی جوانوں کے قد بُت اور ان کی صحت دیکھ کر اس سوچ میں غرق ہو جایا کرتا ہُوں کہ کشمیر کے لئے کون لڑے گا اور پاکستان پر بُرا وقت آن پڑا تو اس کی حفاظت کون کرے گا۔"

۱۹۴۷ء میں جب ہندوستان تقسیم ہو گیا اور کشمیری مسلمان ہندو سامراج سے کشمیر کو آزاد کرانے کے لئے برسرِپیکار ہُوتے تو خان زمان بھی جہاد میں شریک ہو گیا لیکن اس کے بیٹوں نے اسے خاندان کے ساتھ مظفر آباد بھیج دیا اور خود جنگ لڑتے رہے۔ وہ مظفر آباد سے راولپنڈی اور وہاں سے جہلم چلا گیا۔ خان زمان کو بہت افسوس ہے کہ وہ جنگِ آزادی نہیں لڑ سکا .... میں اُسے باتوں باتوں میں اُس دَور میں لے گیا جب وہ جوان ہُوا کرتا تھا۔ اس سے میرے ملنے کا مقصد بھی یہی تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ اس کی جوانی جنگلوں اور پہاڑیوں میں گزری ہے۔ وہ انگریز شکاریوں کے ساتھ شکار پر بھی جاتا رہا ہے۔ میں اس سے اس کی جوانی کی کہانیاں سُننے گیا تھا اور جب میں اس سے دو تین واقعات سُن کر رخصت ہُوا تو میں سوچنے لگا کہ ہمارے ملک میں

انگریزی کی ان کہانیوں سے جن کے ہمیں رسالوں میں ترجمے پڑھائے جاتے ہیں، کہیں زیادہ سنسنی خیز اور دل چسپ کہانیاں موجود ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ یہ سچی وارداتیں اُن لوگوں کے سینوں میں چھپی ہوتی ہیں جن کے ہاتھ میں قلم نہیں اور جو لکھنا پڑھنا جانتے ہی نہیں۔

خان زمان کے سناتے ہوتے واقعات میں سے میں ایک واقعہ اپنے الفاظ میں پیش کرتا ہوں۔ کشمیر میں بب ڈوری ایک مقام ہے جس کے اِرد گرد کا علاقہ دشوار گزار اور پہاڑی ہے۔ خان زمان اسی علاقے کا رہنے والا تھا۔ اُس دَور میں یعنی آج سے بہتر سال پہلے یہ علاقہ جنگلاتی تھا۔ وادیوں میں بعض جگہیں میدانی بھی تھیں۔ خان زمان سرینگر میں محنت مزدوری کرتا تھا۔ ہندوستان کے امیر کبیر لوگ اور انگریز گرمیاں سرینگر گزارا کرتے تھے۔ اس موسم میں روزگار بہت ملتا تھا۔ خان زمان کو وہاں مستقل ملازمت مل گئی، یہ کوئی ہوٹل یا ریسٹ ہاؤس یا ایسی ہی کوئی جگہ تھی جہاں انگریز ٹھہرا کرتے تھے۔ ان میں بعض بڑے شکار کے لئے جاتے تھے اور بعض جنگل جنگل کی سیر کے شوقین تھے۔ وہ کشمیریوں کو قلیوں، راہنماؤں اور مددگار کے طور پر اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ خان زمان شکار کو پسند کرتا تھا۔

اُس زمانے میں کشمیر کے جنگلوں اور پہاڑی علاقوں میں بڑا شکار عام ہوتا تھا۔ اس میں لوہا شیر خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اس شیر کو آپ ببر شیر یا دھاری دار شیر نہ سمجھیں۔ یہ شیر کی ہی نسل سے ہے۔ اس کا رنگ بادامی ہوتا ہے۔ اسے انگریزی میں جاگر کہتے ہیں۔ اس کا مُنہ دھاری دار شیر کی طرح ہوتا ہے۔ قدبُت اس سے کم ہے۔ خصلتیں اور درندگی شیر دل والی ہیں۔ یہ درختوں پر بھی چڑھ جاتا ہے۔ یہی اس کا خطرہ ہے۔ اکثر اوقات یہ کسی درخت سے شکار پر جھپٹتا ہے۔ اس نسل میں ایک اور درندہ بھی اس دَور میں پایا جاتا تھا۔ جسے سیاہ گوش کہتے ہیں۔ اس کا رنگ سرمئی بھی ہوتا ہے اور سرخی مائل زرد بھی۔ کان چونکہ سیاہی مائل ہوتے ہیں اس لئے اسے سیاہ گوش کہتے ہیں۔ ان کے علاوہ کشمیر میں چٹانی بلیاں بھی پائی جاتی تھیں۔ ان میں سب سے زیادہ خطرناک تو تیرہ ہے۔ اس کی

جسامت عام بلی سے دُگنی اور درمیانہ قدوقامت کے کُتے جتنی ہوتی ہے۔

اب کشمیر میں ریچھ ناپید ہو گیا ہے۔ لوہا شیر خاص خاص علاقوں میں اب بھی نظر آتا ہے۔ سیاہ گوش بھی غائب ہو گیا ہے۔ چٹانی بلیوں کی ایک دو نسلیں ابھی باقی ہیں۔ اگست ۱۹۴۷ء تک کشمیر کے ویران علاقوں میں یہ درندے موجود رہے۔ جنگ نے انہیں وہاں سے بھگا دیا۔ البتہ لوہا شیر تلاش کرنے سے مل جاتا ہے۔ مثلاً آزاد کشمیر میں ٹولی پیر نام کا وسیع جنگل ہے جو درّہ حاجی پیر سے جا ملتا ہے۔ اس جنگل میں لوہا شیر مل جاتا ہے۔ یہ شیر چیتے سے زیادہ پھرتیلا اور تیز ہوتا ہے۔ خونخوار بھی چیتے کی طرح ہے۔ قدرت نے اسے بجلی کی سی جو پھرتی دی ہے وہ شکاریوں کو بُری طرح پریشان کرتی ہے۔

اُس وقت خان زمان کی عمر پچیس سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ تین چار انگریز شکاریوں کے ساتھ لوہا شیر کے شکار پر جا چکا تھا۔ وہ سری نگر میں تھا۔ دو انگریز شکاری آئے۔ انہیں بھی بندوق بردار اور گائیڈ کی حیثیت سے خان زمان دیا گیا۔ وہ بہت ہوشیار اور ذہین تھا۔ ان کے ساتھ وہ سرینگر سے روانہ ہوا۔ بارہ مولا میں رات کے لئے قیام کیا تو اُسی روز وہاں اطلاع آئی تھی کہ لوہا شیروں کے ایک جوڑے نے بب ڈوری کے علاقے میں انسانوں کا جینا حرام کر دیا ہے اور وہاں کے دیہاتی وہاں سے بھاگنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ یہ انگریز شکاری بارہ مولا پہنچے تو کسی سرکاری افسر نے انہیں بتایا کہ وہ یہ اطلاع سرینگر اس درخواست کے ساتھ بھیج رہے تھے کہ اس جوڑے کو ختم کرنے کا انتظام کیا جائے۔ ان شکاریوں کو ڈوگرہ فوج کا ایک انگریز افسر ملا۔ اُس نے انہیں بتایا کہ اس خونخوار جوڑے نے سب سے پہلے اس کے دو ڈوگرے سپاہیوں کو کھایا ہے۔ اُس نے کہا کہ اسے مہاراجہ کی درخواست پر ڈوگرہ فوج کی ٹریننگ کے لئے برطانوی ہند کی فوج سے عارضی طور پر بھیجا گیا ہے۔ اس کے سپاہی جنگلوں میں اکیلے اکیلے بھی جایا کرتے تھے۔ اس لئے ضروری تھا کہ شیروں کے جوڑے کو ختم کیا جاتے۔

اطلاع کے مطابق اس جوڑے نے پہلے دو ڈوگرہ سپاہیوں کو کھایا۔ تین

چار دنوں بعد دیہاتیوں کا ایک بچہ جس کی عمر دس گیارہ سال تھی لاپتہ ہو گیا۔ تلاش کے لئے نکلے تو ایک جگہ اس کا صرف سر ملا اور چند ایک ہڈیاں۔ پہلے یہ کہا گیا کہ یہ بھیڑیوں کی کارستانی ہے لیکن بچے کی موت کے تیسرے روز پتہ چل گیا کہ کون سا درندہ ہے۔ ایک آدمی ایک پہاڑی پر ایک درخت کاٹ رہا تھا۔ اس نے نیچے شیروں کی غراہٹ اور پھر کسی انسان کی چیخیں اور واویلا سنا۔ اس نے نیچے دیکھا تو رگوں میں اس کا خون جم گیا۔ دو شیر ایک آدمی کو مار کر گھسیٹ رہے تھے۔ اُس نے پھر یہ نہیں دیکھا کہ شیر لاش کو کہاں لے گئے۔ وہ دوسری طرف سے پہاڑی سے اُترا اور خوف سے کانپتا ہُوا گاؤں پہنچا۔ گاؤں والے اتنے زیادہ خوفزدہ ہو گئے تھے کہ اُنہوں نے لاش کی تلاش کی بھی جرأت نہ کی۔ دوسرے دن ایک چٹان کے دامن میں لاش کی کچلی ہُوئی کھوپڑی ایک ہاتھ اور کچھ ہڈیاں ملیں۔

تین روز بعد ایک جوان عورت رات کے پہلے پہر گھر سے نکلی۔ شیروں کی غراہٹ کے ساتھ عورت کی چیخیں سنائی دیں۔ گاؤں کے چند ایک ہی گھر تھے۔ ان میں سے کوئی بھی باہر نہ نکلا۔ عورت کا خاوند کلہاڑی لے کے باہر گیا۔ چاندنی میں اُسے دو شیر نظر آئے جو اس کی بیوی کو ڈھلان سے اُتار رہے تھے۔ اس نے بہت شور مچایا۔ اس کی مدد کے لئے کوئی بھی نہ نکلا۔

یہ دونوں انگریز شکاری دلیر ضرور تھے، تجربہ کار شکاری معلوم نہیں ہوتے تھے۔ ان کے ساتھ جو ملازم تھے ان میں ایک تو خان زمان تھا اور دوسرا سوات کا رہنے والا ایک جوان آدمی۔ خان زمان کو اس کا نام یاد نہیں رہا۔ تین چار قلی بھی تھے لیکن وہ غریب طبع اور سیدھے سادے آدمی تھے جنہیں شکار کے ساتھ صرف اتنی دلچسپی تھی کہ انہیں روزی کا ایک ذریعہ مل گیا تھا۔ انگریز شکاریوں نے کہا کہ شیروں کے اس جوڑے کو انسانی گوشت کا نشہ ہو گیا ہے۔ اُنہوں نے تین تین دن کے وقفے سے انسان کھاتے ہیں۔ ایک انسان ان دونوں کے لئے دو دن کافی ہوتا ہے۔ اس سے پہلے کبھی شیر گاؤں کے قریب نہیں آتے تھے۔ انسانی گوشت کا نشہ انہیں گاؤں میں لے آیا تھا۔ شکاریوں نے کہا کہ انہیں

جلدی نہ مارا گیا تو یہ دن کے وقت بھی گاؤں میں آجایا کریں گے۔ خان زمان نے مجھے بتایا کہ شیر کسی بھی قسم کا ہو، ببر ہو، دھاری دار یا گلدار، وہ انسان کو صرف اُسی صورت میں شکار کرتا ہے جب وہ بوڑھا ہو جاتا ہے۔ بڑھاپے میں وہ ہرن خرگوش اور اس قسم کے تیز دوڑنے والے شکار کے پیچھے بھاگ نہیں سکتا۔ اس کے دانت اور پنجے بھی کمزور ہو جاتے ہیں۔ اس جسمانی حالت میں انسان آسان شکار ہوتا ہے۔ بعض شیر صرف عورت یا صرف بچے پر حملہ کرتے ہیں کیونکہ یہ اور زیادہ آسان شکار ہے مگر ببر ڈوری کے لوہا شیر دو تھے۔ یہ نر اور مادہ ہی ہو سکتے تھے۔ دو نر اکٹھے شکار نہیں کھیلا کرتے۔ یہ دونوں بوڑھے نہیں ہو سکتے تھے۔ انہیں انسانی گوشت اور خون کی ویسی ہی عادت ہو گئی تھی جیسے چرس اور شراب کی ہوتی ہے۔ انسانی خون درندے پر نشہ طاری کر دیتا ہے۔ لوہا شیر بھوکا نہ ہو تو کسی انسان پر حملہ نہیں کرتا اور آبادیوں سے دُور رہتا ہے۔ غالباً یہ دونوں فوجی ڈوگرے انہیں اس وقت مل گئے تھے جب شیر بھوکے تھے۔ کشمیر پر چونکہ ڈوگروں کا راج تھا اس لئے وہ ہٹے کٹے تھے۔ ان کا گوشت اور خون شیروں کو بہت ہی پسند آیا ہو گا۔

ڈوگرہ فوج کے اس انگریز افسر سے پوچھا گیا کہ سپاہیوں کو ساتھ لے جا کر وہ خود شیروں کو کیوں نہیں مارتا؟ اُس نے بتایا کہ اسے شیر کے شکار کا کوئی تجربہ نہیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ فوجیوں کو استعمال نہیں کر سکتا کیونکہ کوئی سپاہی مارا جائے گا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی سپاہی گھبرا کر گولی چلا دے اور اپنے ہی کسی ساتھی کو مار ڈالے۔ وجہ معقول تھی۔ انگریزی شکاری اُسی وقت تیار ہو گئے۔ ببر ڈوری کا علاقہ چونکہ خان زمان کا اپنا علاقہ تھا اس لئے کسی اور گائیڈ کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے جب اپنے گاؤں کا نام بتا کر کہا کہ وہ اس علاقے سے واقف ہے تو اسے بتایا گیا کہ جو عورت اور بچہ شیروں کا شکار ہوتے ہیں وہ اسی کے گاؤں کے تھے۔ خان زمان پریشان ہو گیا۔ ان دنوں دُور دراز دیہات میں ڈاک کا کوئی انتظام نہیں تھا اس لئے اسے اپنے گھر کے متعلق کچھ خبر نہیں تھی کہ گھر والے کس حال میں ہیں۔

سامان کے لئے تین خچریں ساتھ تھیں۔ سامان میں ایک خیمہ بھی تھا۔ شکاریوں کی سواری کے لئے دو گھوڑے تھے اور ملازم پیدل۔ انہیں راستے میں ایک پڑاؤ کرنا پڑا کیونکہ وہ بے وقت روانہ ہوتے تھے اور فاصلہ زیادہ تھا، کٹھن بھی تھا۔ اگلے روز منزل پر پہنچے تو خان زمان انہیں اپنے گاؤں لے گیا۔ یہ ایک پہاڑی کی ڈھلان پر چند ایک جھونپڑے تھے۔ علاقہ سرسبز اور خوبصورت تھا۔ انگریز شکاریوں کے لئے ایک موزوں جگہ خیمہ گاڑ دیا گیا۔ گاؤں والوں پر خوف وہراس غالب آیا ہوا تھا۔ کچھ دُور ایک گاؤں تھا وہاں بھی یہی عالم تھا۔ یہ گاؤں میدانی علاقے کے دیہات کی طرح نہیں تھے۔ چند ایک جھونپڑے ایک جگہ تھے۔ دو تین ان سے کچھ دُور یا اوپر تھے۔ کسی وادی میں دو اور جھونپڑے تھے۔ آبادی بہت ہی کم تھی۔ ذرائع آمد و رفت ناپید تھے اور یہ معصوم سے لوگ جنگل کے رحم وکرم پر زندہ تھے۔ اگر دو فوجی شیروں کے پیٹ میں نہ چلے جاتے تو ان دیہاتیوں کا کسی کو کوئی غم نہ ہوتا۔ انہیں درندے کھا جاتے یا یہ کسی اور آفت کا شکار ہو جاتے تو سری نگر میں عیش وعشرت میں بدمست مہاراجے کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔

شیروں کی تلاش شروع ہو گئی۔ وہ جگہیں دیکھی گئیں جہاں شیروں نے انسانوں پر حملے کئے تھے اور وہ جگہیں بھی دیکھی گئیں جہاں سے ان بدنصیبوں کی ہڈیاں اور کھوپڑیاں ملی تھیں۔ شیروں کے پنجوں کے نشان ڈھونڈے گئے لیکن سبزہ زیادہ تھا اس لئے یہ نشان کم ہی نظر آتے۔ انگریز شیروں کی کچھار ڈھونڈ رہے تھے۔ اُن کا ارادہ یہ تھا کہ کچھار کے سامنے مورچہ باندھ لیا جاتے اور وہ جوں ہی باہر آئیں انہیں نشانہ بنا لیا جاتے، مگر کچھار کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔ چھوٹی سی ایک ندی نے ایک جگہ جھیل بنا رکھی تھی۔ خیال تھا کہ شیر وہاں پانی پینے آتے ہوں گے۔ وہاں ان کے پنجوں کے نشان ملے لیکن یہ نشان کوئی رہبری نہ کر سکے۔ مسئلہ یہ بھی تھا کہ پہچان کیسے کی جاتے گی کہ انسانوں کو کھانے والا جوڑا کون سا ہے۔

تلاش سے ناکام ہو کر وہی طریقہ اختیار کیا گیا جو شیر کے شکار کے [illegible]

اختیار کیا جاتا ہے۔ یہ تھی مچان جو کسی درخت پر بنائی جاتی ہے مگر اس علاقے میں چیل اور دیودار کے درخت تھے جن کا تنا سیدھا اور اس کی ٹہنیاں بہت اونچی ہوتی ہیں۔ یہ درخت مچان کے لئے موزوں نہیں ہوتے۔ وہاں جو دوسری اقسام کے موزوں درخت تھے وہ موزوں جگہوں پر نہیں تھے۔ ایک جگہ چیل کے تین درخت دیکھے گئے جو ایک دوسرے کے بہت قریب قریب تھے۔ گاؤں والوں سے کہہ کر تین چار درخت کٹوا لئے گئے۔ ان کے تنوں اور ٹہنوں کو ان تین درختوں کے تنوں کے ساتھ باندھا گیا۔ یہ درخت مثلث بناتے تھے۔ ان کے ساتھ باندھی ہوئی لکڑیوں کی اچھی خاصی مچان بن گئی۔ اس سے پندرہ بیس گز دُور دو درخت ایک دوسرے کے قریب تھے۔ ان کے ساتھ بھی کٹے ہوئے تنے باندھ کر دو آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ بنا لی گئی۔ یہ مچانیں خان زمان کے لئے عجیب اور دلچسپ تھیں۔ اُس وقت تک وہ اتنا ہی جانتا تھا کہ شیر کو آمنے سامنے آکر گولی سے مارا جاتا ہے اور اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس علاقے کے دو آدمیوں نے دو شیر برچھیوں اور کلہاڑیوں سے مارے تھے۔

شام سے کچھ دیر پہلے مچانوں کے سامنے ایک بکری کا میمنا باندھ دیا گیا۔ بڑی مچان پر ایک انگریز شکاری کے ساتھ خان زمان ٹارچ لے کر بیٹھا اور چھوٹی مچان پر دوسرا انگریز بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ سواتی تھا۔ اس کے پاس بھی ٹارچ تھی۔ انگریزوں نے ان دونوں سے کہا کہ وہ کوئی آواز پیدا نہ کریں اور اشارے پر ٹارچ کی روشنی وہاں ڈالیں جہاں میمنا بندھا ہوا ہے ۔۔۔

شکاریوں کے پاس بارہ بور کی شکاری دو نالی بندوقیں تھیں۔ ان میں انہوں نے بڑے جانور کو مارنے والے کارتوس بھر لئے اور رات گزرنے لگی۔ گیدڑوں کی چیخ و پکار سنائی دینے لگی۔ ان آوازوں میں بھیڑیوں کی آوازیں بھی تھیں۔ خطرہ یہ تھا کہ بھیڑئیے میمنے پر آگئے تو سارا کھیل بگڑ جائے گا۔ بہت دیر بعد میمنا جو آہستہ آہستہ ممیا رہا تھا بڑی زور سے بولا اور اس کے کودنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ہلکی ہلکی غراہٹ بھی سنائی دی۔ شکاریوں کے اشاروں پر خان زمان اور سواتی نے ٹارچیں جلا دیں۔ تین بھیڑئیے میمنے کی طرف آ رہے

تھے۔ اُنہوں نے جسموں کو حملے کی پوزیشن میں کر رکھا تھا۔ شکاریوں نے شور مچایا۔ خان زمان اور سواتی نے بھی طرح طرح کی آوازیں نکالیں۔ بھیڑیئے رک گئے مگر وہ میمنے جیسی من بھاتی غذا سے اتنی جلدی دستبردار نہیں ہو سکتے تھے۔ انہیں ڈرانے کے لئے کوئی گولی نہیں چلائی جا سکتی تھی کیونکہ خطرہ تھا کہ مطلوبہ شیر کہیں قریب ہُوئے تو بھاگ جائیں گے۔

شکاریوں کے کہنے پر ٹارچیں بجھا دی گئیں کیونکہ سیل ختم ہونے کا ڈر تھا۔ چاروں نے شور شرابہ جاری رکھا۔ بھیڑیوں کی ہلکی غراہٹ میں ایک گونجدار اور سخت غصیلی غراہٹ سنائی دی۔ ٹارچیں پھر جل اُٹھیں۔ بھیڑیئے بھاگ گئے۔ وہ انسانوں کے شور سے نہیں بھاگے تھے۔ وہ اپنے سے زیادہ خونخوار اور طاقتور درندے کے ڈر سے بھاگے تھے۔ یہ شیر ہی ہو سکتا تھا۔ بھیڑیئے گھوم کر دوسری طرف سے آئے اور میمنے سے تھوڑی دُور رک گئے۔ اچانک اندھیرے سے ایک شیر نے جست لگائی اور ایک بھیڑیئے کے اُوپر جا پڑا۔ دوسرے بھیڑیئے غائب ہو گئے اور وہ جو شیر کی گرفت میں آ گیا تھا، جانے کس طرح اس کے پنجے سے نکل گیا۔ اس کے فوراً بعد دوسرا شیر گولی کی طرح آیا اور سب درندے ٹارچ کی روشنی سے نکل گئے۔ یہ سارا ڈرامہ دو تین سیکنڈ میں ہو گیا۔ شکاریوں کو شیروں کا نشانہ لینے کی مہلت نہ ملی۔ ٹارچیں بجھا دی گئیں۔ تین بھیڑیوں اور دو شیروں کے درمیان بکری کے ذرا بچے میمنے پر جو گزر رہی تھی وہ اس کی اچھل کود اور عجیب و غریب آوازوں سے ظاہر ہوتی تھی۔ چھوٹے سے بچے سے رسی ٹوٹتی نہیں تھی۔

تھوڑی ہی دیر بعد دبے دبے قدموں کی ہلکی ہلکی آہٹ سنائی دینے لگی۔ میمنا اور زیادہ چیخ و پکار کرنے لگا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہلکی غراہٹ بھی سنائی دی۔ اس میں غصہ اور تلخی نہیں تھی۔ شکاریوں کے اشارے پر خان زمان اور سواتی نے ٹارچیں جلا دیں۔ ایک سیکنڈ کے لئے نظر آیا کہ دونوں شیر اس طرح کھڑے تھے کہ میمنا ان کے درمیان کھڑا کانپ رہا تھا۔ اس کی آواز شاید خوف کی انتہا سے بند ہو گئی تھی۔ خان زمان کے ساتھ والے شکاری نے

نشست باندھی۔ ایک شیر نے میمنے کے منہ کے ساتھ منہ لگا کر سونگھا اور ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ابھی کوئی گولی نہیں چلی تھی کہ سواتی کے ہاتھ سے ٹارچ چھوٹ گئی اور نیچے جا پڑی۔ دوسرے شکاری نے عین اسی وقت گولی چلائی لیکن شیر بدک کر اس طرح غائب ہو چکے تھے جیسے آنکھ جھپکی جاتی ہے۔ ان کی پھرتی کی یہ انتہا جیسے وہ کھڑے کھڑے جادو کے زور سے غائب ہو گئے ہوں۔ اس سے زیادہ حیرت یہ دیکھ کر ہوئی کہ شیروں نے میمنے کو صرف ایک بار سونگھا تھا اُسے پکڑا اور مارا نہیں تھا۔ شیر بکری یا اپنے کسی بھی شکار کو سونگھا نہیں کرتا اور نہ سوچا کرتا ہے۔ یہ دونوں شیر میمنے کے پاس کھڑے رہے جیسے اس کے ساتھ انہیں کوئی دلچسپی نہ ہو۔ اگر سواتی کے ہاتھ سے ٹارچ نہ گرتی تو شیروں کو مار لیا جاتا۔ دونوں شکاریوں نے اسے بہت ڈانٹا اور اسے یہ سزا دی کہ اسی وقت اسے نیچے اترنے اور ٹارچ اٹھا لانے کا حکم دیا گیا۔ نیچے خطرہ تھا کہ شیر کہیں قریب ہی نہ ہوں۔ خان زمان نے اسے ٹارچ کی روشنی دی اور وہ ٹارچ اٹھا کر اوپر چلا گیا۔ رات بھر انتظار کرتے رہے، شیر نہ آئے اور بھیڑیئے بھی نہ آئے۔ ایک جنگلی بلی آئی جو میمنے کو تھوڑی دیر پریشان کر کے چلی گئی۔

صبح طلوع ہوئی تو سب واپس آ گئے۔ گاؤں والوں نے رات ایک گولی کی آواز سنی تھی۔ وہ خوش تھے کہ ایک شیر مار لیا گیا ہے مگر وہ بہت مایوس ہوئے۔ انہیں جب یہ بتایا گیا کہ شیروں نے میمنے کو چھیڑا تک نہیں تو وہ حیران نہیں ہوئے بلکہ ڈر گئے۔ یہ معجزہ تھا کہ شیروں نے بکری کے بچے کو نہ کھایا۔ گاؤں کے دو بوڑھوں نے پورے یقین کے ساتھ کہا کہ یہ شیر نہیں ہیں۔ یہ مرے ہوئے کافروں کی بدرُوحیں ہیں جو مسلمانوں کو کھا رہی ہیں۔ گاؤں والوں نے فوراً تسلیم کر لیا اور وہ سوچنے لگے کہ بدروحوں کو بھگانے کے لئے کسے بلائیں۔ بعض نے نذر نیاز دینے کا اعلان کر دیا اور کسی نے پونچھ کے کسی بزرگ کے پاس جانے کا مشورہ دیا۔ انگریز شکاریوں نے یہ معمّہ حل کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ یہ شیر انسانی گوشت اور خون کے اتنے زیادہ نشئی ہو چکے ہیں کہ اب انہیں بکری کا گوشت اچھا نہیں لگتا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ انہیں مچانوں پر بیٹھے ہوئے

انسانوں کی بُو آ رہی تھی۔ ایک شیر نے میمنے کو سُونگھ کر یہ معلوم کرنا چاہا تھا کہ یہ بُو اس کی تو نہیں۔ اگر وہاں انسانوں کی بُو نہ ہوتی تو وہ بکری کے بچے کو کھا لیتے۔ ایک انگریز شکاری نے اس خطرے کا اظہار کیا کہ لوہا شیر درخت پر چڑھ سکتا ہے اور یہ ممکن ہے کہ وہ دونوں کسی ایک مچان پر چڑھ آئیں۔

وہ دن شکاریوں نے سو کر گزار دیا۔ شام سے ذرا پہلے بکری کے بچے کی جگہ گائے کا ایک چھوٹا سا بچھڑا لیا گیا۔ اسے مچانوں کی جگہ لے گئے اور اس جگہ باندھ دیا جہاں گذشتہ رات بکری کا بچہ باندھا گیا تھا۔ رات گزرتی رہی۔ بہت دیر بعد قریب کہیں بھیڑیوں کی آوازیں سنائی دیں مگر وہ بچھڑے کے قریب نہ آئے۔ اس کے بعد ہمیں سامنے دو چمکتی آنکھیں دکھائی دیں۔ فوراً ہی یہ آنکھیں چار ہو گئیں۔ یہ شیروں کا جوڑا تھا۔ آنکھیں غائب ہو گئیں۔ پھر یہ ایک اور جگہ نظر آئیں۔ بچھڑا تڑپنے اور بولنے لگا۔ اسے اپنے قریب شیروں کی موجودگی کا احساس ہو گیا تھا۔ ابھی ٹارچیں نہ جلائی گئیں۔ شیر ابھی دُور تھے، مگر وہ بچھڑے کے پاس آتے نظر نہیں آتے تھے۔ آنکھیں غائب ہو گئی تھیں۔ خان زمان نے اپنی مچان کے نیچے آہٹ سُنی۔ اس کے شکاری نے اُسے نیچے روشنی ڈالنے کو کہا۔ اس نے مچان کے بالکل نیچے روشنی ڈالی اور جھک کر دیکھا تو اسے ایک شیر نظر آیا جو ایک درخت کے تنے کے ساتھ کھڑا اوپر دیکھ رہا تھا۔ دوسرا نظر نہیں آتا تھا۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ شیر جانوروں میں نہیں انسانوں میں دلچسپی رکھتے ہیں دوسری مچان کے شکاری نے اس گھبراہٹ سے گولی چلا دی کہ شیر اُوپر چڑھنے لگے ہیں۔ صبح دیکھا کہ گولی درخت کے تنے میں لگی تھی۔

اس گولی کے بعد نہ کوئی شیر نظر آیا نہ ان کی آنکھیں۔ رات جاگتے اور اُونگھتے گزر گئی۔ صبح بچھڑے کو صحیح و سلامت واپس لے آئے۔ گاؤں کے لوگوں کو پتہ چلا کہ شیر آئے تھے اور انہوں نے بچھڑے کو بھی نہیں کھایا تو وہ اور زیادہ ڈر گئے۔ بزرگوں نے تصدیق کر دی کہ یہ شیر نہیں بدروحیں ہیں۔ فوراً ہی ایک روایت مشہور ہو گئی کہ کچھ عرصہ گزرا ایک ہندو اپنی بیوی کے ساتھ کہیں جا رہا تھا۔ راستے میں ڈاکوؤں نے انہیں روک لیا۔ وہ انہیں لوٹ کر بیوی کو بھی ساتھ لے

جانا چاہتے تھے، لیکن ہندوؤں نے مقابلہ کیا جس میں دونوں میاں بیوی مارے گئے۔ اب یہ دونوں اپنے خون کا انتقام لیتے پھر رہے ہیں۔

انگریز شکاریوں نے یہ راستے دی کہ تین دن گزر گئے ہیں شیروں نے کوئی انسان نہیں کھایا۔ اب وہ اتنے بھوکے ہوں گے کہ کسی بھی جانور کو کھالیں گے۔ اُنھوں نے فیصلہ کیا کہ آج رات بڑی بکری باندھی جائے گی۔ اگر شیروں نے بکری بھی نہ کھائی تو کوئی اور ترکیب سوچی جائے گی۔ گاؤں والوں سے کہہ دیا گیا کہ وہ باہر نہ جائیں۔ ایک آدمی نے چٹانوں کے قریب باندھنے کے لئے اپنی بکری پیش کر دی۔ اُسی سے کہا گیا کہ وہ شام سے پہلے بکری چٹانوں کی جگہ پہنچا دے۔ دونوں انگریز کھا پی کر سو گئے۔ خان زمان اور سواتی بھی گہری نیند سو گئے۔ وہ سب دوپہر کے کھانے کے لئے جاگے۔ کھانا کھا کر وہ شام کا انتظار کر رہے تھے۔ خان زمان اور سواتی انگریزوں کے ملازموں کے ساتھ خیمے کے قریب بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ گاؤں کے دو آدمی سخت گھبراہٹ کی حالت میں دوڑتے آئے۔ اُنھوں نے بتایا کہ شیر ایک آدمی کو مار لے گئے ہیں۔

معلوم ہوا کہ یہ وہی آدمی تھا جس نے اپنی بکری پیش کی تھی۔ اسے کہا گیا تھا کہ وہ سورج غروب ہونے سے کچھ دیر پہلے بکری چٹانوں تک لے جائے۔ وہ نوجوان تھا اور سیدھا سادا بھی۔ اس کے ساتھ دو دوست تھے۔ وہ دوپہر کو ہی بکری لے کے چل پڑے۔ مرنے والے کے دوستوں نے بتایا کہ وہ چٹانوں پر چڑھنا چاہتے تھے۔ بہر حال موت اس نوجوان کو لے گئی۔ راستے میں وہ بکری کو پکڑے ہوئے آگے آگے جا رہا تھا اور اس کے دوست پیچھے رہ گئے۔ ان میں سے ایک نے شیر کو دیکھ لیا تھا۔ شیر حملے کی پوزیشن میں تھا۔ اس آدمی نے بکری والے کو آوازیں دیں مگر شیر نے جست لگا دی اور اسے دبوچ لیا۔ دوسرا شیر بھی سامنے آگیا۔ بکری والا ختم ہو گیا اور اس کے دوست بھاگ آئے۔ ذرا سے وقت میں گاؤں کے لوگ انگریز شکاریوں کے خیمے کے گرد جمع ہو گئے۔ مرنے والے کی ماں، اس کے باپ اور دو بہنوں کے بین اور دھاڑیں برداشت نہیں ہوتی تھیں۔ اس بدنصیب کا ایک بڑا بھائی تھا۔ اس نے کہا — "اگر تم دو بندوقوں

کے ہوتے ہوتے بھی شیروں کو نہیں مار سکتے تو میں اکیلا اس کلہاڑی سے شیروں کو ماروں گا۔"

ایک اور آدمی نے کہا ـــــ "میرے پاس برچھی ہے۔ میں اس کے ساتھ جاؤں گا۔"

یہ دونوں آدمی خالی جوش میں آکر بڑ نہیں مار رہے تھے۔ انہوں نے شیروں کو مارنے کا پکا ارادہ کر لیا تھا۔ خان زمان بھی ان کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو گیا اور اسے دیکھ کر سواتی نے بھی ان کا ساتھ دینے کا اعلان کر دیا۔ ان دونوں نے انگریز شکاریوں سے کہا کہ وہ ان کے ساتھ چلنا چاہتے ہیں تو چلیں لیکن شیر سامنے آئیں تو وہ گولی نہ چلائیں۔ تماشہ دیکھتے رہیں۔ اگر وہ دیکھیں کہ ان میں سے کسی کی جان خطرے میں ہے تو گولی چلائیں۔ انگریزوں نے پہلے ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ چونکہ ابھی آدھا دن باقی ہے اس لئے ابھی سے شیروں کا تعاقب کریں گے۔ انہوں نے کہا کہ انہیں یہی ڈر تھا کہ شیر ایک آدھ دن میں کسی انسان پر حملہ کریں گے۔

یہ پارٹی چل پڑی۔ اس میں دو انگریزی شکاری تھے جن کے پاس ایک ایک دونالی بندوق اور کارتوس تھے۔ خان زمان تھا جس کے پاس برچھی تھی۔ سواتی کے پاس ڈیڑھ فٹ لمبی تلوار تھی۔ باقی دو آدمیوں کے پاس کلہاڑیاں تھیں۔ یہ دو آدمی سخت غصے میں تھے۔ مرنے والے کا ایک دوست وہ جگہ دکھانے کے لئے ساتھ ہو لیا جہاں شیروں نے اس آدمی پر حملہ کیا تھا۔ روانہ ہوتے وقت خان زمان نے گاؤں والوں سے کہا ـــــ "اگر آج شیر نہ مرے تو ہم میں سے کوئی بھی واپس نہیں آئے گا۔ دعا کرو اللہ ہمیں کامیاب کرے" ـــــ عورتوں نے بلند آوازوں سے انہیں دعائیں دیں ـــــ اور یہ لوگ ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

جس جگہ شیروں نے حملہ کیا تھا وہاں خون تھا۔ مرنے والے کے دوست کو وہاں سے واپس چلے جانے کو کہا گیا مگر وہ جوش میں آگیا۔ اس نے کہا ـــــ "میں اپنے دوست کے خون کا بدلہ لوں گا" ـــــ وہاں تک چند اور آدمی بھی آگئے تھے۔ ان میں سے ایک کے پاس کلہاڑی تھی جس کا دستہ چھوٹا تھا۔ اس نے اس آدمی سے

کلہاڑی لے لی اور شکاری پارٹی کے ساتھ چل پڑا۔ لاش کو گھسیٹنے کے نشان اور خون کے دھبے پوری طرح نمایاں تھے۔ یہ لوگ انہیں دیکھ دیکھ کر چلتے گئے۔ شیر کی خصلت ہے کہ وہ شکار کو جہاں مارتا ہے وہیں نہیں کھاتا۔ کہیں اور لے جاکر، عموماً اپنی کچھار میں رکھ دیتا ہے اور دیر بعد کھانا شروع کرتا ہے۔ پورے اطمینان سے کھاتا ہے۔ بعض اوقات شیر شکار کو پوری رات رکھے رکھتا ہے اور اگلے روز کھاتا ہے .... پہاڑیوں اور چٹانوں کے دامن کے ساتھ ساتھ چلتے اور موڑ مڑتے ندی تک پہنچ گئے۔ اس کے کنارے ایک جگہ بہت سا خون تھا۔ یہاں شاید شیروں نے لاش کو چھوڑ کر پانی پیا ہوگا۔ آگے خون کم ہوتا جارہا تھا۔ گھاس پر گھسیٹنے کے نشان تھے۔

بہت آگے جاکر ندی الگ ہٹ گئی اور وہ ایک وادی میں داخل ہو گئے۔ وادی کھلتی گئی اور آگے خاصی کشادہ ہو گئی۔ کسی نے کہا —"وہ دیکھو، اُوپر"— اُوپر دیکھا تو ایک درخت کے ٹہن پر لاش پڑی تھی۔ شیر [illegible]! لاش [illegible] پیٹ کے بل ٹہن پر رکھا تھا۔ اُس کا اُوپر کا دھڑ ایک طرف اور نیچے کا دوسری طرف لٹک رہا تھا۔ وہ جگہ اس طرح تھی کہ وہ ایک پہاڑی تھی۔ ذرا اُوپر جاکر اس کا کچھ حصہ دیوار کی طرح ہو گیا تھا۔ ڈھلان پر بڑ کی قسم کا درخت تھا جس کے ٹہن پہاڑی کے ساتھ ملے ہوتے تھے۔ اس دیوار کے اُوپر اور ذرا پیچھے ہٹ کر گھنی جھاڑیاں اور درخت تھے اور وہیں سے پہاڑی سیدھی اُوپر اُٹھتی تھی۔ یہ جگہ ایسی تھی جو شیروں کی کچھار کے لئے موزوں تھی۔ ایک طرف سے ڈھلان پر چڑھا جاسکتا تھا۔ جہاں لاش رکھی ہوتی تھی اس کے نیچے تھوڑی سی جگہ ہموار تھی۔ وہاں سے ڈھلان شروع ہوتی تھی جس کی بلندی دس بارہ گز ہوگی۔ شیروں نے لاش نہایت محفوظ جگہ رکھی تھی۔

انگریز شکاری بندوقوں کے گھوڑے چڑھا کر ذرا اُونچی جگہوں پر ایک دوسرے سے دُور دُور بیٹھ گئے اور ہر طرف دیکھنے لگے تاکہ شیر کسی بھی طرف سے آجائیں تو انہیں نشانہ بنالیں۔ سراتی نے انہیں کہا کہ وہ پہلے انہیں موقع دیں کہ وہ اپنے ہاتھوں شیروں کو مار سکیں۔ انہوں نے مل کر شور مچایا۔ شیر باہر

نہ آتے۔ انہوں نے اوپر پتھر پھینکے۔ شیر پھر بھی باہر نہ آتے۔ انگریزوں نے کہا کہ شیر باہر گئے ہوتے ہیں۔ یہاں ہوتے تو باہر آجاتے۔ انگریز اور زیادہ چوکس ہو گئے۔ انہیں تو توقع تھی کہ کسی بھی لمحے شیر کہیں سے آجائیں گے۔ یہ آدمی اُوپر نہیں گئے کیونکہ جہاں کچھار کا امکان تھا وہاں لڑنے کے لئے زیادہ جگہ نہیں تھی۔ پانچ آدمیوں کے لئے وہ جگہ ناکافی تھی۔ وہ شیروں کو نیچے کھلی جگہ لانا چاہتے تھے، مگر شیر تھے کہاں؟ وہاں تو خاموشی تھی اور وہاں ایک لاش پڑی تھی۔

جس کی لاش تھی اُس کے بھائی سے رہا نہ گیا۔ وہ دوڑ کر اُوپر اُس جگہ گیا جو لاش والے ٹھن کے نیچے تھی۔ درخت عجیب سا تھا اور بڑی عجیب جگہ تھی۔ اس کی ایک جڑ پہاڑی کے عمودی حصے کے ساتھ ساتھ باہر کو نیچے تک آگئی تھی۔ اس آدمی نے جڑ کو پکڑا اور تھوڑا اُوپر گیا تو اس کا ہاتھ لاش کی لٹکتی ٹانگوں تک پہنچ گیا۔ اُس نے ٹخنہ پکڑا اور نیچے کو جھٹکے دینے لگا۔ لاش آہستہ آہستہ سرکی اور نیچے آپڑی۔ بھائی نے نیچے آکر لاش کو کندھوں پر اُٹھا لیا۔ دوسرے آدمی اُس کی مدد کو اُوپر جانے ہی لگے تھے کہ سواتی نے چلا کر کہا ―― "پیچھے کو ہٹ جاؤ۔ کلہاڑی اُٹھالو" ―― اس کی پکار کے ساتھ ہی شیر اتنی زور سے غرّایا کہ سب ڈر گئے۔ اُوپر دو شیر کھڑے نظر آتے جو ٹانگیں سکیڑ کر حملے کے لئے تیار تھے اور سخت غصے میں غرّا رہے تھے۔ مگر وہ نظر آتے اور دوسرے لمحے ان میں سے ایک تیر کی طرح نیچے آیا۔ اُس کے پیچھے دوسرا آیا۔ پہلا شیر اُس آدمی کے اُوپر گرا جس نے لاش اُتاری تھی۔ وہ لاش کندھوں پر ڈال چکا تھا۔ شیر چونکہ اُوپر سے بہت تیزی سے آیا تھا اس لئے وہ لاش اور اس کے بھائی کے ساتھ ہی اُس تھوڑی سی ہموار جگہ سے ڈھلان پر آیا اور یہ سب لڑھکتے ہوتے نیچے آگئے جہاں یہ پارٹی شیروں کو لانا چاہتی تھی۔

دوسرا شیر بھی بجلی کی تیزی سے آیا۔ انگریزوں نے غالباً شیروں اور انسانوں کی لڑائی دیکھنے کے لئے گولی نہ چلائی، یا انہیں نشانہ لینے کا موقع ہی نہیں ملا ہوگا۔ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ لوہا شیر حیران کن حد تک پھرتیلا ہوتا ہے۔ یہ کچھ سوچنے اور سمجھنے کا موقعہ نہیں دیا کرتا۔ لاش کے بھائی کو لاش نے بچا لیا

کیونکہ یہ اُس کے کندھوں پر تھی۔ شیر لے پنجے اسی میں گاڑے تھے مگر بھائی کی کلہاڑی اُدپر ہی رہ گئی تھی۔ اُس کے چاروں ساتھی فوراً اُس جگہ پہنچ گئے جہاں ڈھلان ختم ہوتی تھی۔ آگے آگے خان زمان تھا۔ اُس نے اس ارادے سے برچھی تانی کی شیر کو سنبھلنے کا موقعہ نہیں دے گا لیکن اُس کی ایک ٹانگ کی پنڈلی دانتوں کے شکنجے میں آگئی۔ یہ دوسرا شیر تھا جس نے اُس کی پنڈلی مُنہ میں لے لی تھی۔ شیر عموماً اگلی ٹانگیں اُٹھا کر حملہ کرتا اور گردن مُنہ میں لیا کرتا ہے لیکن اس شیر نے معلوم نہیں کیوں کُتوں کی طرح نیچے سے حملہ کیا تھا۔ خان زمان گِرا اور بہت تیزی سے گھوما۔ شیر نے اس کی پنڈلی کا پٹھا کاٹ ڈالا اور پنڈلی چھوڑ کر دوسرے حملے کے لئے پیچھے ہٹا۔ خان زمان برچھی سنبھال کر اُٹھا۔ اُس کی خوش قسمتی تھی کہ کلہاڑی والا ایک آدمی قریب تھا اور شیر کے پیچھے۔ اُس نے شیر کو حملے کی مہلت نہ دی۔ پوری طاقت سے اُس کی کمر پر کلہاڑی کا وار کیا۔ شیر تیزی سے پیچھے کو مڑا تو خان زمان نے جست لگا کر اُسے برچھی ماری جو اس کے پہلو میں اُتر گئی۔ دوسرے آدمی کی کلہاڑی کا دوسرا وار بھی شیر کی کمر میں اُترا۔ ریڑھ کی ہڈی کٹ جانے سے وہ ایک ہی جگہ گھومنے لگا۔ کلہاڑی اور خان زمان کی برچھی نے اُسے زیادہ دیر گھومنے نہ دیا۔ وہ گرا تو کلہاڑی اس کے سر پر پڑی اور برچھی پسلیوں میں اُتر گئی۔

خان زمان کو ایک بھر دوسری گولی کے دھماکے سنائی دیئے۔ اُدھر دیکھا تو وہاں دو آدمی تڑپ رہے تھے۔ ہُوا یوں تھا کہ دوسرے شیر نے لاش کے بھائی کی گردن پیچھے سے مُنہ میں لے لی تھی۔ سواتی نے تلوار کا وار کیا مگر شیر اس آدمی کو بھنبھوڑ رہا تھا اور اسے اپنے ساتھ گھما رہا تھا اس لئے تلوار کا وار اس آدمی کے بازو پر پڑا جس کی گردن شیر کے مُنہ میں تھی۔ اُس نے دوسرا وار شیر پر کیا تو شیر نے اُس آدمی کو چھوڑ کر سواتی پر جست لگائی۔ تلوار کا وار خالی گیا تھا۔ شیر بجلی کی طرح اُس پر آیا تھا۔ سواتی نے نوک کی طرف سے تلوار شیر کے سینے میں گھونپی۔ سینہ سامنے تھا کیونکہ شیر پچھلی ٹانگوں پر کھڑا تھا۔ تلوار پوری طرح نہیں لگی۔ شیر نے سواتی کا مُنہ اپنے مُنہ میں لے لیا۔ اُس وقت

ایک انگریز نے جو قریب آگیا تھا شیر کے پہلو میں یکے بعد دیگرے دونوں نالیوں کے کارتوس فائر کردیتے۔ شیر اتنی جلدی مرا نہیں کرتے لیکن یہ گولیاں دل کو کاٹ گئی تھیں اس لئے شیر گر پڑا اور ذرا سا تڑپ کر ٹھنڈا ہوگیا۔

دونوں شیر مار لئے گئے مگر یہ پارٹی گاؤں میں پہنچی تو ساتھ دو لاشیں تھیں۔ ایک وہ جسے شیر دل نے مارا تھا اور دوسری لاش اُس کے بھائی کی تھی۔ شیر نے پیچھے سے اُس کی گردن مُنہ میں لے کر بھنبھوڑا تھا۔ اس سے گردن کٹ گئی اور ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ وہ زندہ نہ رہ سکا۔ شیر نے سواتی کا مُنہ اپنے مُنہ میں لے لیا تھا لیکن انگریز نے بروقت گولیاں چلا کر اُسے چھڑا لیا تھا۔ اُس کے مُنہ پر زخم آئے تھے لیکن مہلک نہیں تھے۔ خان زمان کی پنڈلی کا پٹھا باہر آگیا تھا۔ یہ نشان اُس کی جوانی کی یادگار کے طور پر اب بھی موجود ہے اور اتنا بھدا ہے کہ دیکھا نہیں جاتا۔ پٹھا الگ ہوکر جسم کا بے جان حصہ بنا ہوا ہے اور پنڈلی میں گہرا گڑھا سا ہے۔ انگریز شکاریوں کے پاس فسٹ ایڈ کا سامان تھا۔ انہوں نے خان زمان اور سواتی کی مرہم پٹی کردی۔ گاؤں والوں کے پاس بھی کوئی دیسی ٹوٹکے تھے۔ انگریزی اور دیسی دواؤں نے مل کر خون روک دیا۔

دونوں شیروں کو گاؤں والے اٹھا لائے۔ ان میں ایک نر اور دوسری مادہ تھی۔ اُن کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ دانت اور پنجے مضبوط تھے۔ انگریز سمجھ نہ سکے کہ یہ انسانی گوشت کے عادی کس طرح بن گئے تھے۔ خان زمان کو اپنے گھر والوں نے راز کی یہ بات بتائی اور کہا کہ کسی سے ذکر نہ کرے ورنہ سارے گاؤں کو سزا کے طور پر موت مل جائے گی۔ اُس نے یہ راز پہلی بار میرے آگے فاش کیا۔ اب اسے اور اُس کے گاؤں والوں کو کوئی سزا کے طور پر موت نہیں دے سکتا۔ راز یہ تھا کہ دو فوجی ڈوگرے ایک روز اُس کے گاؤں کے قریب سے گزرے۔ یہ اُسی فوج کے تھے جنہیں انگریز افسر اس علاقے میں ٹریننگ کے لئے لایا تھا۔ اُن کا کیمپ گاؤں سے دُور تھا۔ یہ دونوں معلوم نہیں کیوں گاؤں کے قریب سے گزرے۔ وہاں سے دو تین عورتیں کھیتوں میں کام کر رہی تھیں۔

ان میں ایک جوان لڑکی تھی۔ ڈوگروں نے لڑکی کو پکڑ لیا۔ اُس دَور میں مسلمانوں کی وہاں حیثیت غلاموں کی سی تھی۔ اُن سے بیگار بھی لی جاتی تھی اور اُن کی مستورات کی عزت ڈوگروں کے رحم وکرم پر تھی۔ ذرا سی بات پر مسلمان کو قید یا قتل کر دیا جاتا تھا۔ ڈوگروں کا راج تھا، اور یہ راج مُسلم کش تھا۔

ان دو ڈوگروں نے لڑکی کو پکڑ لیا۔ دوسری عورتیں بھاگ گئیں۔ گاؤں کے تین چار آدمی جن میں لڑکی کا باپ اور جوان بھائی بھی تھا دوڑے گئے۔ انہوں نے ڈوگروں کی منت سماجت کی لیکن وہ وحشی بنے ہوئے تھے۔ باپ دونوں ڈوگروں کو الگ لے گیا۔ دوسروں نے دیکھا کہ ڈوگروں نے اُسے پیسے دیتے اور اس کے ساتھ گاؤں کی طرف چل پڑے۔ اس نے اپنی بیٹی کو بھی ساتھ لیا۔ دوسرے آدمیوں نے آپس میں کھُسر پھُسر کی اور کہا کہ یہ باپ بے غیرت ہے جو ڈوگروں سے پیسے لے کر اپنی بیٹی کی عزت انہیں دے رہا ہے۔ مسلمان مجبور بھی تھے۔ یہ باپ ڈوگروں کو اپنے گھر لے گیا۔ اُس کا جوان بیٹا بھی اپنے گھر چلا گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد باپ بیٹا باہر آئے۔ انہوں نے گاؤں کے مردوں کو پکارا۔ باپ بیٹے کے کپڑے خون سے لال تھے۔ باپ نے سب کو بتایا کہ وہ ان دونوں ڈوگروں کو اپنی بیٹی کی عزت کا سودا کر کے دھوکے میں گھر لے آیا تھا۔ اندر لے جا کر اس نے اپنے بیٹے کو بتایا کہ اُس کا ارادہ کیا ہے۔ اُس نے ڈوگروں کی رائفلیں رکھوا کر بٹھایا اور باپ بیٹے نے پیچھے سے ان پر کلہاڑیوں سے حملہ کر دیا اور دونوں کو ختم کر دیا۔

گاؤں چند ایک جھونپڑوں کا تھا۔ سب گھر مسلمانوں کے تھے۔ وہ مجبور تھے بے غیرت نہیں تھے۔ وہ لڑکی کے باپ کی مدد کے لئے تیار ہو گئے۔ باپ بیٹے کے کپڑے بدلوا کر دھلوا دیئے گئے۔ ڈوگروں کی لاشیں اور رائفلیں چھپا دی گئیں۔ خون کا نشان بھی نہ رہنے دیا گیا اور فیصلہ ہُوا کہ دونوں لاشیں رات کو کہیں دبا دی جائیں گی۔ وہ دن بھر ڈرتے رہے کہ ڈوگروں کی تلاش میں کوئی ادھر آنکلا تو گھروں کی تلاشی لی جاتے گی۔ شام کے بعد تک کوئی نہ آیا۔ اندھیرا ہوتے ہی لاشیں اور رائفلیں اُٹھا کر لوگ چل پڑے اور ایک پہاڑی کی ڈھلان

پر گڑھا کھود کر لاشیں اور رائفلیں اس میں رکھ دیں اور مٹی ڈال دی۔ جو مٹی بچی وہ اِدھر اُدھر پھینک دی۔ گڑھا غالباً گہرا انہیں کھودا گیا تھا۔

دوسرے دن گڈریوں نے بتایا کہ دو ڈوگرے فوجیوں کو شیروں نے کھا لیا ہے۔ گاؤں والے بہت حیران ہوتے۔ وہ پہلے اُس جگہ گئے جہاں انہوں نے دو لاشیں دبائی تھیں۔ وہاں رائفلیں پڑی تھیں لاشیں نہیں تھیں۔ ایک بوڑھے نے کہا کہ رات کو شیروں یا بھیڑیوں نے لاشیں نکال لی ہوں گی مگر لاشوں کے بچے کھچے حصے بہت دُور سے ملے تھے۔ لہٰذا یہ شیر ہو سکتے تھے۔ بھیڑیے لاش کو گھسیٹ کر نہیں لے جاتے۔ جہاں ملے وہیں کھا لیتے ہیں۔ اس بوڑھے کی تجویز پر دونوں رائفلیں گڑھے سے نکال کر کہیں دور پھینک دی گئیں اور گڑھا مٹی سے بھر دیا گیا۔ فوج کو معلوم ہی نہ ہو سکا کہ ان ڈوگروں کو قتل کیا گیا تھا۔ انہیں شیروں کا شکار سمجھا گیا۔ یہ پہلے دو انسان تھے جو شیروں نے کھائے۔ انہی کے گوشت نے انہیں انسان کے گوشت کا عادی اور نشئی بنایا تھا۔

کریلی کا شفاخانہ

صنوبر کے تناور درختوں کی اوٹ سے سورج طلوع ہوا۔ ہم کریلی کیمپ میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ہم چہچہاتے پرندوں کی نغمہ ریزی سے لطف اندوز ہوتے، مدھیہ پردیش (بھارت) کے اس کوہستانی کیمپ میں گوند قوم کے ایک نامی گرامی شکاری پرما کا انتظار کر رہے تھے۔ پرما کے متعلق مشہور تھا کہ اس سے جنگل کے درندے بھی خوف کھاتے ہیں۔ شیر کے شکار کا جنون، پرما سے ملاقات کا اشتیاق اور میرے چچا وحید اللہ کا فرضِ منصبی انہیں کشاں کشاں یہاں لے آیا تھا۔ میں بھی جنگل کی پُر لطف مگر پُر خطر مہم میں ان کے ہمراہ تھی۔ عورتیں کم ہی درندوں کے شکار کو جایا کرتی ہیں لیکن میں مردوں کی اس مہم میں شریک ہو گئی تھی۔

جنگل کے تاریک گوشے ابھی روشنی سے پوری طرح منوّر نہیں ہوتے تھے کہ ایک فارسٹ گارڈ مہابت خان، پرما کو ساتھ لئے حاضر ہوا۔ پرما قوی ہیکل نوجوان نہ تھا۔ اس کی آنکھوں کی غیر معمولی چمک اور چہرے سے ٹپکتی ہوئی ذہانت اس کی بے پناہ قوتِ ارادی کا پتہ دیتی تھی۔ گوند قوم کو ٹھل دیس کے اس نوجوان پر بڑا ناز تھا اور وہ کمال بانکپن سے شکاری بندوق کندھے پر ڈالے ہوتے تھا۔

پرما نے دو پہاڑوں کے درمیان بہتی ہوئی شفاف ندی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ وہاں نرم ریت پر مختلف جانوروں کے نقشِ پا واضح ہیں۔ کچھ تو چیتلوں کے ہیں اور کچھ ہرنوں کے نقوش لیکن ایک ہی نقشِ پا ایسا ہے جیسے کوئی شیر ان جانوروں کے تعاقب میں ادھر سے گذرا ہو۔ خطرہ تھا کہ شیر کے

نقشِ قدم پر چلتے چلتے ہم اس کی کچھار تک جا پہنچتے۔ ہم ایسا خطرہ مول لینے کے لئے تیار نہیں تھے نہ اس میں شکاریانہ عقل مندی تھی۔ چنانچہ مناسب سمجھا کہ جنگل کے اس حصے میں ہانکا کرایا اور مچان بندھوائے جائیں۔ قاعدے کے مطابق درختوں پر مچان بندھوائے گئے۔ دوپہر ڈھلے ہانکا کرنے والے ایک سو گونڈ مزدوروں کی طلبی ہوئی۔ وہ مضحکہ خیز انداز میں اپنے جوان ننگے سینوں پر کنستر باندھے ہوئے تھے۔ لمبی مضبوط رسیاں ان کے کندھوں پر جھول رہی تھیں۔ ان کے آبنوسی سیاہ جسم جنگل کے منظر کو اور ہیبت ناک اور پُراسرار بنا رہے تھے۔

پرمانے شاہانہ انداز سے سرخ رومال لہرایا تو کنستر نہایت بھیانک اور غضیلی آواز میں بجنے لگے۔ پودوں میں سرسراتی ہوئی رسیوں کے جھٹکوں سے درخت اور گھاس زلزلے کے سے انداز میں ہلنے لگے۔ چپ چاپ جنگل چیختی چلاتی آوازوں سے بھر گیا۔ سہمے ہوئے پرندے گھنے درختوں سے پھڑپھڑاتے ہوئے اُڑے اور خوف زدہ بولیاں بولتے فضا کی لامتناہی وسعت میں گم گئے۔ قیامت خیز شور کے ساتھ ہانکا کرنے والوں کا حلقہ تنگ ہو رہا تھا۔ فرطِ جوش سے سینوں میں دل تیزی کے ساتھ دھڑک رہے تھے۔ ہر لمحہ توقع تھی کہ کسی سرسراتی جھاڑی سے شیر کا غضب ناک چہرہ نمودار ہوگا اور شکاری، زندگی اور موت کے خوفناک دھانے پر آکھڑے ہوں گے۔ گولیاں چلیں گی اور شیر کا پنجۂ اجل کسی بدقسمت انسان کو موت کے گھاٹ اتار دے گا۔ بچا سے زیادہ مجھے ان کے چار معصوم بچوں کی فکر لاحق تھی جو کریلی سے آٹھ سو میل دُور بیٹھے اپنے ابا کی جان لیوا مہمات سے بے خبر تھے۔ مجھ پر ہیجانی کیفیت طاری تھی۔ کنستروں کی ٹھمک، ٹھمک ٹھک سے کان پھٹے جا رہے تھے۔ لیکن ہانکا ختم ہوگیا اور جنگل نے یوں چپ سادھ لی جیسے یہاں کچھ ہُوا ہی نہ ہو۔ خفت کے مارے پرما کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ اس نے سرخ رومال سے اپنے اُلجھے ہوئے بالوں سے گرد جھاڑی اور انگوٹھے سے زمین کو کرید کر ہارے ہوئے سے انداز سے بولا —— "ہانکا ناکام ہوگیا ہے صاحب!" —— چچا وحید اللہ کے چہرے پر مایوسی کے

آثار دیکھ کر وہ بڑبڑانے لگا ـــ "گاؤں کا کوئی آدمی شکار میں مہارت نہیں رکھتا۔ پہلے ہانکے میں شیر موجود تھا۔ مگر ان بزدل اناڑیوں کی غفلت سے وہ بچ کر نکل گیا ہے۔ افسوس کہ میں ہانکوں کا پہلا سا اہتمام نہ کر سکا۔ مجھے معاف کر دیجئے صاحب!" ـــ اس نے عجز کے طور پر دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ شام کے دھندلکے جنگل کی فضا پر چھانے لگے تھے۔ چچا کو پرما کے عجز نے متاثر کیا تو اسے کیمپ میں چلنے کی دعوت دی۔ کچھ تیز تاڑی کا اثر، کچھ چچا کی دلجوئی کا پُرخلوص احساس، پرما الاؤ کے گرد بیٹھ کر جنگل اور شکار کی دلچسپ کہانیاں سنانے لگا۔ اس نے الاؤ میں ایک اور لکڑی جھونکتے ہوئے کہا۔

"صاحب شیروں کے دہشت ناک واقعات لوگوں کے اعصاب پر اس حد تک سوار ہیں کہ وہ شیر کے تعاقب کی جرأت نہیں کرتے۔ اسی دہشت کا اثر ہے کہ یہاں کے لوگ قسمت اور تقدیر کے قائل ہو چکے ہیں اور شیر کو خدا کا بھیجا ہُوا قہر تصوّر کرتے ہیں" ـــ اس نے آہ بھری اور دُکھے ہوتے سے لہجے میں کہنے لگا ـــ "وہ ایک لڑکا تھا جس میں شکاریوں کی سج دھج موجود تھی۔ لیکن افسوس اس کی زندگی نے وفا نہ کی۔ تین سال گذرے وہ شیر کا لقمہ بن گیا۔"

چچا وحید اللہ نے تین سال بیشتر کسی رینجر کی زبانی کریلی کے گرد و نواح میں کسی شیر کی ہلاکت آفرینیوں کے تذکرے سُنے تھے۔ انہوں نے مزید ٹوہ لگانے کی غرض سے پوچھا۔

"اس لڑکے کی موت کس طرح واقع ہوئی تھی پرما؟" ـــ پرما الاؤ کی راکھ کرید کر طویل خاموشی کے بعد بولا ـــ "روپا اس گاؤں کی ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ گاؤں کے دو نوجوان اسے چاہتے تھے۔ ایک جوشی تھا جو غریب خاندان کا نورِ نظر تھا۔ روپا کو اس کا مردانہ حسن اور پاکیزہ کردار پسند تھا۔ روپا پر ایک اور نوجوان سدھو کی بھی نظر تھی لیکن وہ مالدار ہونے کے علاوہ بدکردار تھا۔ رُوپا کی ماں سدھو کی مقروض تھی۔ روپا سایۂ پدری سے محروم ہو چکی تھی۔ چنانچہ سدھو کا قرضہ ماں بیٹی کے لئے وبالِ جان بن گیا تھا...

"تین سال ہوتے روپا کی ماں مہوے کی گٹھلیاں چُننے نکلی مگر پلٹ کر گھر

نہ آئی۔ روپا رات بھر انتظار کرتی رہی۔ اگلی صبح ہم روپا کی ماں کی تلاش میں نکلے۔ اس بدقسمت عورت کی مسخ شدہ لاش ایک تنگ گھاٹی میں پڑی تھی۔ ظالم درندے نے اس کے جسم کو چباڈالا تھا۔ چاندی کے کڑوں سے اس کی لاش کی شناخت کی گئی۔ لاش کے اردگرد شیر کے پنجوں کے نشان تھے اور انسانی خون ایک قریبی جھاڑی تک پھیلا ہوا تھا....

"روپا نے اپنی ماں کی نیم خوردہ لاش دیکھی تو اس پر دیوانگی طاری ہو گئی۔ شیر کے خلاف انتقامی جذبہ بھڑک اُٹھا۔ اس نے دیوانہ وار چیختے ہوئے اعلان کیا کہ وہ اس شخص سے شادی کرے گی جو شیر سے میری ماں کے خون کا بدلہ لے گا۔"

پرما آہ بھر کر کہنے لگا — "جوشی کے جذبے نے جوش مارا اور وہ اس شیر کو مارنے کے لئے تیار ہوگیا، لیکن اس غریب کے پاس بندوق نہ تھی۔ اس نے میری بندوق مانگی اور منع کرنے کے باوجود اس درخت پر بیٹھ گیا جس کے نیچے روپا کی ماں کی لاش پڑی تھی۔ صبح کاذب کے وقت شیر آیا۔ جوشی نے وفورِ جذبات سے مغلوب ہو کر بندوق چلائی۔ شیر گر پڑا لیکن جوشی درخت پر اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ صبح ہوئی تو لوگوں نے دیکھا کہ شیر کی لاش کے ساتھ جوشی کی لاش بھی پڑی تھی....

"چند روز بعد ایک بوڑھا انگریز ہمارے گاؤں شکار کھیلنے آیا۔ روپا نے اسے سنایا کہ وہ سدھو کی مقروض ہے اور اس کی ماں شیر کا نوالہ بن چکی ہے۔ اس انگریز نے اس پر ترس کھایا اور روپا کو اپنی بیٹی بنا کر ساتھ لے گیا۔ گاؤں میں پھر اس کی خبر نہ ملی۔ البتہ سدھو جہاں جاتا ہے جوشی کی روح شیر پر سوار ہو کر اس کا تعاقب کرتی ہے۔ پنڈتوں اور پروہتوں نے لاکھ جتن کئے لیکن بلا نہ ٹلی۔ آخر سدھو دل برداشتہ ہو کر گاؤں چھوڑ گیا اور آج کل چائے کے باغات میں مزدوری کرتا ہے۔"

ہم روپا اور جوشی کی درد بھری المیہ داستان سے بے حد متاثر ہوئے۔ پرما یہ وعدہ کر کے رخصت ہوا کہ وہ آج رات مناسب مقامات پر دو بچھڑے

بند ہوجائے گا اور اگلی رات مچان پر بیٹھ کر قسمت آزمائی کی جائے گی۔

کریلی کیمپ کی وہ رات بڑی بھیانک تھی۔ ساری رات جنگل درندوں کی گرجدار آوازوں سے گونجتا رہا۔ بڑے موروں کی خلاف توقع کوک خونخوار جانوروں کی موجودگی کا پتہ دیتی تھی، لیکن ان آوازوں میں کسی شیر کے دھاڑنے کی آواز شامل نہ تھی۔ البتہ تمام رات جانوروں کی دنیا میں حشر بپا رہا۔ چچا وحید اللہ تو بارہ بجتے ہی لمبی تان کر سو گئے لیکن جانوروں کی گرجیلی آوازوں اور درختوں کی ٹہنیوں میں سرسراتی اور سر پٹختی ہواؤں کی تندی و تیزی نے مجھے تمام رات بیدار رکھا۔ ایک بار تو یوں محسوس ہوا جیسے کوئی درندہ دبے پاؤں کیمپ کے چکر کاٹ رہا ہو۔ دروازے کے ساتھ آہٹ سنائی دی۔ مجھے سُرخ سُرخ دو آنکھیں بھی نظر آئیں۔ لیکن میں نے اسے وہم تصوّر کر کے ایک طویل جھرجھری کے ساتھ اپنے آپ کو کمبل کی دبیز تہوں میں لپیٹ لیا۔

سحر طلوع ہو رہی تھی جب میری آنکھ لگی، لیکن کوئی دروازے کا کواڑ بُری طرح کھٹکھٹا رہا تھا۔ میں نے چچا وحید اللہ کا کندھا جھنجھوڑا، محکمہ جنگلات کا افسر تمام تفکرات سے بے نیاز سویا پڑا تھا۔ میرے چیخنے چلانے پر وہ اُٹھے اور دروازہ کھولا۔ پرما ایک دوسرے گوند شکاری کے ہمراہ دروازے پر کھڑا تھا۔ چہرے پر پریشانی کے آثار ہویدا تھے اور اس کے ساتھی کی جامد نگاہیں کیمپ کے آس پاس بکھری ہوئی خاک دھول پر جمی تھیں۔ باہر زمین پر شیر کے پنجوں کے گہرے نشانات موجود تھے۔

"شیر رات آپ کے کیمپ کا طواف کرتا رہا ہے جناب!" —— پرما نے تشویش بھری نگاہوں سے چچا وحید اللہ کی طرف دیکھا۔ انہوں نے حیرت کے عالم میں باہر نکل کر دیکھا تو شیر کے پنجوں کے نشانات دروازے تک موجود تھے۔ کواڑ پر پنجوں کی خراشیں بھی موجود تھیں۔ چچا نے اشارے سے مجھے بلایا اور مسکرا کر بولے —"رات ایک معزز مہمان ہماری ملاقات کے لئے آیا تھا شازی! لیکن وہ کسی وجہ سے باریابی حاصل نہ کر سکا۔"

"یہ جنگل بڑا بے رحم ہے صاحب!" —— پرما نے دُکھ زدہ مسکراہٹ سے کہا۔

برچچا وحید اللہ اور گوند شکاری کریلی کیمپ میں شیر کی آمد پر تبصرہ کرتے ہوئے
ان بدقسمت بچھڑوں کو دیکھنے چل دیے جو گھنے جنگل میں ساری رات شیر کا شکار
بننے کے منتظر رہے تھے۔ ایک بچھڑا درماندگی کی تصویر بنا زندہ سلامت موجود تھا۔
چنانچہ اس نے نہایت معصومیت کے ساتھ سر ہلا کر شکر گذار نظروں سے آنے والوں
کا استقبال کیا۔ دوسرا مارا جا چکا تھا۔ اس کی شہ رگ کٹی ہوئی تھی۔ شیر نے اسے گھسیٹ
کر گھنی جھاڑیوں میں لے جانے کی کوشش کی تھی، لیکن کسی وجہ سے کامیاب نہ
ہو سکا تھا۔ چنانچہ اس جگہ نیا مچان بندھوایا اور ایک اور بچھڑا باندھا گیا۔ پرما نے
بتایا کہ یہ شیر بڑا مکار ہے۔ کسی جھاڑی میں چھپ کر بیٹھ رہتا ہے اور دن دہاڑے
بھی کسی انسان پر جھپٹنے سے گریز نہیں کرتا۔ بسا اوقات یوں بھی ہوا کہ یہ شیر کسی
نواحی بستی میں پہنچا اور آبادی کے جانوروں کو چھوا تک نہیں اور کسی بدنصیب
انسان کو اٹھا کر لے گیا۔

بچھڑے کے مر جانے سے شکار پارٹی خوش تھی۔ دوپہر ڈھلے چچا وحید اللہ
شیر کے شکار کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ خوشی ان کے چہرے سے جھلک
رہی تھی اور شیر کا شکار کھیلنے کی ترنگ ان کی آنکھوں میں چمک رہی تھی۔ انہوں
نے میرا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "شکاریوں کی زندگی میں ایسا وقت بھی آتا ہے
بیٹی! صبح چائے کی میز پر بیٹھ کر میرا انتظار نہ کرنا۔ اگر زندگی نے وفا کی تو خوشی کی
مجلس پھر جمے گی اور شکار کی تاریخ میں ایک نئی کہانی کا اضافہ ہو گا۔"

شام کے جھٹ پٹے میں، میں نے شکار پارٹی کو نظروں سے اوجھل ہوتے
دیکھا۔ شکاری اسی طرح شیر کو مارنے جاتے ہوں گے لیکن میں یہ منظر پہلی بار دیکھ
رہی تھی اور دل بوجھل ہوتا جا رہا تھا۔ دو سجیلے جوان موت کے منہ میں جا رہے
تھے۔ میں سوچ رہی تھی کہ وہ کسی درخت پر بیٹھ کر زندگی یا موت کا انتخاب کریں
گے اور صبح طلوع ہونے تک فیصلہ ہو چکا ہو گا —— زندگی یا موت!

مہابت خان گارڈ اور پرما کا ساتھی کریلی کیمپ کی حفاظت پر معمور تھے
لیکن میں اپنی ذات سے زیادہ شکاریوں کی فکر میں تھی۔ ذرا بھی آہٹ ہوتی تو
میرے کان کھڑے ہو جاتے اور دل دھک دھک کرنے لگتا۔ ہوا درختوں کی

ٹہنیوں کو چٹخاتی تو مُنہ سے بے اختیار نکل جاتا "اللہ خیر"۔ گیارہ بجے کے قریب میری آنکھ لگی ہی تھی کہ مہابت خان نے دروازے پر بڑے زور سے دستک دی۔ میں ہڑبڑا کر اُٹھی۔ مہابت خان نے دروازوں سے اندر جھانکتے ہوئے کہا "ابھی ابھی جنگل سے گولیاں چلنے کی آوازیں آتی ہیں بی بی! اور کسی انسان کی چیخ بھی سنائی دی ہے۔"

"میرے اللہ انسانی چیخ!" — میرا دل دہل گیا۔ کمرے میں موم بتی کی لو ٹمٹما رہی تھی۔

"تم مرد ہو مہابت خان!" — میں نے گھبرا کر کہا — "اپنی بندوق سنبھالو۔ وہ مشعل بردار کنستر پیٹنے والے گوند کہاں ہیں؟ انہیں آواز دو اور دیکھو کون جنگل کی بھینٹ چڑھ گیا ہے؟"

"آپ گھبرائیں نہیں" — مہابت خان کی آواز میں لرزہ تھا۔

"اگر تم مرد ہوتے ہوئے گھبرا گئے تو میں تنہا جنگل میں گھُس جاؤں گی۔ مہابت خان! تم دیکھو گے کہ میں بپھری ہوئی شیرنی بن جاؤں گی۔"

"ہم جا رہے ہیں" — مہابت خان نے میرا چیلنج قبول کرتے ہوئے کہا — "ہم چل دیتے بی بی جی!" — اور میں نے نمناک نگاہوں سے لاتعداد روشنیوں اور مشعلوں کو جنگل کی طرف بڑھتے دیکھا۔ معاً کچھ ملی جلی آوازیں کانوں کے پردوں سے ٹکرانے لگیں۔ آوازیں بلند ہوتی چلی گئیں جو شور کی صورت اختیار کرنے لگیں۔ پھر یہ شور کریلی کیمپ کی طرف بڑھا۔ میں برآمدے میں جا کھڑی ہوتی۔ میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ جنگل کا شور مجھ پر ہول طاری کر رہا تھا۔ میں نے دیکھا۔ گوند شکاری کسی کو کندھے پر ڈالے بے ہنگم آوازیں نکالتے بھاگے چلے آتے تھے۔

"چلّی او۔ چلّی او۔"

چند لمحوں بعد پر ماکا گٹھا ہوا بے جان جسم درخت کی کٹی ہوئی ٹہنی کی طرح کریلی کیمپ کے برآمدے میں پڑا تھا اور چچا وحید اللہ کھڑے آنکھوں سے آنسو پونچھ رہے تھے۔

"یہ کیا ہو گیا چچا؟" — میں حیرت سے چلاّتی۔ انہوں نے دُکھ بھری آواز میں کہا —

"جو نہیں ہونا چاہیئے تھا بیٹا! شیر نے گولی کھا کر پرما کو مچان سے اچک لیا۔ یہ قسمت کا کھیل ہے بیٹی!"

ہر شخص چپ تھا۔ بہادر پرما رات کے گپ اندھیرے میں موت سے مات کھا گیا تھا۔ ظالم کریلی کیمپ میں یہ ہماری دوسری دردبھری رات تھی۔

ہم تیسرے روز بھانڈا کے ریلوے سٹیشن سے گاڑی پر سوار ہوتے تو گوند قوم کے شکاریوں کا ایک ہجوم آنکھوں میں آنسو بھرے ہمیں الوداع کہنے کے لئے موجود تھا۔ ہم ہنستے مسکراتے ضلع بھانڈا میں آتے تھے لیکن روتے ہوتے اس کوہستان سے رخصت ہو رہے تھے۔

اس دردانگیز واقعے کو پندرہ سال کا طویل عرصہ گذر گیا۔ اس دوران اس سانحے کی یاد ایک کسک بن کر آتی اور بہت دیر تڑپاتی رہی۔ اتفاق سے سولہ سال کے بعد ہم ایک بار پھر کریلی کیمپ میں جا خیمہ زن ہوتے۔ وہی جنگل، وہی سناٹا اور مہوے کا وہی گھنا درخت موجود تھا جس کے قریب بیٹھ کر پرما نے روپا کی دکھ بھری داستانِ الم سنائی تھی۔ لیکن اب یہ جگہ سنسان ہو گئی تھی۔ جنگلی بیلیں اور گھاس جگہ جگہ اُگی ہوئی تھیں۔ پرانے لوگ مر چکے تھے۔ چچا کی اپنی عمر ڈھل رہی تھی اور میں ایک الھڑ دوشیزہ کی بجائے بیاہتا عورت تھی۔

کریلی میں ایک نمایاں تبدیلی نظر آئی۔ مہوے کے درخت کے قریب ایک صاف ستھرا اور سفید مکان تعمیر ہو چکا تھا جو اپنی نفاست اور طرزِ تعمیر کی بنا پر آبادی کے دیگر جھونپڑوں سے منفرد نظر آتا تھا۔ اگرچہ یہ چپ چاپ اور الگ تھلگ مکان بظاہر پُراسرار سا لگتا تھا، لیکن اس میں ایک خلوت پسند خاتون گذشتہ تین سال سے قیام پذیر تھی۔ غالباً وہ گرجے کی زیرِ سرپرستی جنگل کے مفلوک الحال عوام کی طبّی امداد کا نیک جذبہ لے کر آئی اور دکھی انسانیت کے علاج معالجے میں مشغول تھی۔ کریلی کے لوگ اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے، لیکن وہ اس خاتون کے خاندانی حالات سے قطعاً ناواقف تھے۔

درندوں کی ہلاکت آفرینیوں کے باوجود کریلی کی شامیں بہت حسین ہوتی ہیں۔ چیل اور دیودار کے بلند و بالا درختوں کی اوٹ سے

اُبھرتا ہُوا شفق رنگ سورج اور جھاڑیوں سے آنکھ مچولی کھیلتے ہوتے اندھیرے اجالے۔ ہم ایک شام کے نظارے میں مشغول تھے کہ میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس ایک آدمی ہمارے پاس آیا۔ ادب سے سلام کیا اور چچا وحید اللہ سے کہنے لگا۔ "صاحب! سامنے مکان میں بی بی ڈاکٹر آپ کو بلاتی ہیں۔ وہ سخت بیمار ہیں۔"

ایک اجنبی خاتون سے ملاقات کرنے میں چچا نے جھجک محسوس کی۔ وہ ہمارے لئے بالکل اجنبی تھی۔ لیکن میں نے چچا کی ہمت بندھائی تو ان کا جذبہ انسانی جاگ اُٹھا۔ ہم اس مکان میں داخل ہوتے تو ایک کشادہ کمرے میں سادہ سا فرنیچر پڑا تھا اور وہ نحیف خاتون بستر پر دراز تھی۔ اس نے کپکپاتی آواز اور شستہ انگریزی میں ہمارا شکریہ ادا کیا۔ جب ہم بیٹھ چکے تو وہ رک رک کر بولنے لگی۔

"مجھ پر ہیضے کا شدید حملہ ہُوا ہے۔ جب تک کالے کوس کی مسافت طے کر کے کوئی ڈاکٹر آتے گا، میں مر چکی ہوں گی۔ میرے پاس ایک امانت ہے جو آپ کے حوالے کرنا چاہتی ہوں"۔ ہم نے آمادگی کے انداز میں گردن ہلائی۔ تو اس نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔

"یہ گاؤں میرا اپنا وطن ہے۔ میرا بچپن یہیں کھیلتے گذرا۔ میں یہیں جوان ہوئی۔ ایک انگریز کرنل اوسبورن کی مہربانی سے میں نرس بن گئی۔ اب میں ایک امانت اپنی لیڈی ڈاکٹر مارٹن کی نذر کرنا چاہتی ہوں"— اس نے گفتگو کا سلسلہ منقطع کر کے ایک بنک بک میرے ہاتھ میں تھما دی اور آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا — "میں اپنی زندگی کا تمام اثاثہ مارٹن کے حوالے کرتی ہوں۔ وہ اس سرماتے سے یہاں شفاخانہ تعمیر کرا دیں گی اور میری روح بڑا سکھ پاتے گی۔ دیکھو"— اس نے مہوے کے درخت کی طرف کپکپاتے ہاتھوں سے اشارہ کرتے ہوتے کہا — "میری قبر اس مہوے کے سائے تلے کھودنا اور قبر پر لکھ دینا — بدنصیب رودبا۔"

شدتِ جذبات سے ہمارا دم گھٹنے لگا۔ مہوے کے درخت پر ملول

پرندے غمگین نغمے الاپ رہے تھے اور وہ خاتون کریلی میں آخری شبِ غم گزار کر دنیا سے رخصت ہو گئی۔

"اس جنگل میں نہ جانے کس کس کی محبت دفن ہے شازی!" ــــ چچا وحید اللہ نے کہا ــــ "چلو اس پاپی مہابن سے چلو اور ان درختوں کو روپا کا ماتم کرنے دو" ــــ کریلی کا شفاخانہ اب بھی، سیاحوں کو روپا کی یاد دلاتا ہے۔

کتاب کا کور

عامر بلال

رابطہ

فیس بک

https://www.facebook.com/aamiralibilal

ٹویٹر

http://twitter.com/aamirbilal

انسٹاگرام

https://www.instagram.com/aamirbilal

یوٹیوب

https://www.youtube.com/@aamirbilal

سزا جو گواہ کو ملی

انسان کی زندگی ٹیلی ویژن جیسی ہے۔ طرح طرح کے کھیل تماشے اور ڈرامے دکھاتی ہے۔ بعض ڈرامے قسط وار ہوتے ہیں۔ میں آپ کو ایک ڈرامہ سناتا ہوں۔ میں پولیس انسپکٹری سے ریٹائر ہوا تھا۔ جناب احمد یار خان اور محبوب عالم کی تفتیشی کہانیاں پڑھتا رہتا ہوں۔ ان کی اکثر کہانیاں دیہات کے علاقوں کی ہوتی ہیں۔ دیہات کے علاقے آزادی سے پہلے بھی دلچسپ ہوتے تھے اور یہ آج کل بھی دلچسپ ہیں۔ بس اتنا فرق پڑا ہے کہ دلچسپیاں تھوڑی تبدیل ہو گئی ہیں۔

یہ دونوں انسپکٹر صاحبان دیہات کے غریب افراد کا ذکر کیا کرتے ہیں جو گاؤں کے چوہدریوں اور بڑے زمینداروں کے گھروں میں غلاموں کی طرح کام کرتے ہیں۔ انہیں کمین اور کامے کہا جاتا ہے۔ یہ ہوتے تو خدا کے بندے ہیں لیکن خدا کے کچھ بندے ان بے چاروں کو روٹی کپڑے کے بدلے اپنے زر خرید بندے بنا لیتے ہیں۔ ان کامے لوگوں میں کچھ افراد، خاص کر ان کی عورتیں اپنے مالکوں کے اندر کے رازوں میں شریک ہوتی ہیں۔ یہ بھی ان کی ڈیوٹی میں شامل ہوتا ہے کہ اپنی جان دے دیں راز کسی کو نہ دیں۔ یہ غریب جانتے ہیں کہ راز منہ سے نکل گیا تو مالک جان نکال دیتے یا گاؤں سے نکال دیتے ہیں لیکن پولیس پتھروں میں سے بھی راز نکال لیا کرتی ہے۔

یہ کہانی ایسی ہی ایک کامی عورت کی ہے۔ اس کا نام جو کچھ بھی تھا اس کے ساتھ آپ کی کیا دلچسپی ہے۔ آپ اسے ماشو کہہ لیں۔ ان لوگوں کے نام اسی طرح کے ہوتے ہیں۔ یہ کوئی بھی وضع نہیں کر سکتے۔ مثلاً مجھے ایک مزارعہ

کا نام یاد ہے۔ افراسیاب نام تھا اور باپ کا جلال دین تھا لیکن ایک گواہی ہیں اُس کے مالکوں نے میرے کاغذوں میں نام لکھوایا تھا۔ افرا ولد جالا۔

تھوڑے سے سال پہلے کا واقعہ ہے۔ میں دیہاتی علاقوں کے تھانوں میں بڑی لمبی سروس گزار کر پاکستان کے ایک بہت بڑے شہر کے ایک تھانے میں تعینات ہُوا تھا۔ یہ ایک نئی آبادی تھی جس میں اکثریت کوٹھیوں کی تھی۔ چھ مہینے اُس تھانے میں گزر گئے تھے۔ ایک روز میں تھانے کے گیٹ میں کھڑا تھا۔ ایک عورت جس کی عمر چالیس سال کے اوپر یا ذرا نیچے ہو گی، اچانک میرے آگے آگئی۔ وہ تھانے کے سامنے سے گزر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر رُک گئی۔ وہ کسی کی نوکرانی معلوم ہوتی تھی۔

"اللہ تیرا بھلا کرے" — اُس نے کہا — "مجھے اتنی زیادہ سزا دے کر تجھے کیا ملا؟"

"مجھے تو کچھ یاد نہیں" — میں نے ہنستے ہوتے کہا — "تُو نے جُرم بھی ایسا ہی کیا ہو گا جس کی اتنی زیادہ سزا ملی ہو گی ..... کہاں کی بات کر رہی ہو؟"

"جرم یہی کیا تھا کہ دو قاتلوں کو پکڑوایا تھا" — اُس نے کہا۔

اُس نے ایک اور ضلعے کے ایک گاؤں کا نام لیا۔ وہاں کے دو تین بڑے زمینداروں کے نام لئے پھر مجھے مقتول اور دونوں قاتلوں کے نام بتاتے تو مجھے سارا واقعہ یاد آگیا اور یہ عورت بھی یاد آگئی۔ یہ اُس وقت سے تقریباً پانچ سال پہلے کی واردات تھی جس وقت یہ عورت عاشو مجھے شہر کے تھانے میں ملی تھی۔ یہ واردات والے گاؤں کی رہنے والی تھی۔ مجھے یہ بھی یاد آگیا کہ اس کا خاوند بھی تھا۔ اولاد نہیں تھی۔

میں اُس وقت دیہات کے جس علاقے کے تھانے میں تھا، اس میں یہ گاؤں بھی آتا تھا۔ بڑے زمیندار خاندان کا ایک جوان آدمی قتل ہو گیا۔ میں نے تفتیش شروع کی تو پتہ چلا کہ قاتلوں کا کوئی سراغ ہی نہیں۔ کھُرے مل گئے تھے لیکن کھُروں پر مجرموں کی تصویریں تو نہیں ہوتیں۔ مقتول کی نہ اپنی کوئی دشمنی تھی نہ اُس کے خاندان کی کوئی عداوت تھی۔

بیس بائیس دنوں تک مجھے کوئی سراغ نہ ملا۔ عاشو اور اس کا خاوند بڑے گھروں کے کامے تھے۔ ایک معمولی سے اشارے پر میں نے اُن سے پوچھا تو انہوں نے ایسے اشارے دے دیئے جن سے میں قاتلوں تک پہنچ گیا۔ یہ دو سگے بھائی تھے۔ یہ بھی بڑی زمینداری والے خاندان کے تھے۔ دونوں کا جرم ثابت کر کے میں نے انہیں عمر قید دلائی تھی۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" — میں نے عاشو سے پوچھا۔

"سنو گے؟" — اُس نے کہا — "تم نے وعدہ کیا تھا کہ ہمیں بچا کر رکھو گے لیکن جو سزا ہمیں نے بھگتی ہے وہ خدا کسی کو نہ دے۔"

ایسے گواہوں کو مجرموں سے اُس وقت تک ہی بچایا جا سکتا ہے جب تک مقدمہ چلتا ہے۔ اس کے بعد پولیس ان کی حفاظت کا انتظام نہیں کیا کرتی۔ مجھے پانچ سال بعد اس عورت کی کہانی سننے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اگر باقاعدہ مقدمہ درج کرانے کے لئے آتی تو میں سُنتا لیکن اپنی دلچسپی کے لئے اور انسانی ہمدردی کی وجہ سے میں اُسے اپنے کمرے میں لے گیا اور اس نے یہ کہانی سنائی۔

دونوں بھائیوں کو سزا تے عمر قید ہو گئی تو ان کے باپ وغیرہ نے عاشو اور اس کے خاوند کو گاؤں میں اتنا پریشان کیا کہ وہ وہاں سے بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔ گاؤں میں "حقہ پانی بند کرنا" ایک سزا ہوتی ہے جسے سوشل بائیکاٹ کہتے ہیں۔ غریب آدمی کا جو بڑے گھروں کا محتاج ہو، سوشل بائیکاٹ ہو جاتے اور اس کے ساتھ اُسے قتل کی دھمکیاں ملتی رہیں تو وہ کیسے زندہ رہ سکتا ہے۔ عاشو اور اُس کے خاوند کو قاتل بھائیوں کے بزرگ حکم دیتے تھے کہ وہ عدالت میں پیش نہ ہوں لیکن پولیس کے حکم کو وہ نہیں ٹال سکتے تھے۔ انہوں نے گواہی دی اور قاتلوں کے خاندان نے انہیں سزا دی۔

میاں بیوی کی فریاد سُننے والا کوئی نہ تھا۔ اگر وہ میرے پاس آکر شکایت کرتے تو میں ان کی حفاظت کا کوئی بندوبست کرتا لیکن غریب لوگ مالکوں بلکہ اپنے دیوتاؤں کے خلاف کہیں بھی عرض رپورٹ نہیں کر سکتے تھے۔ اُن کی خیریت

اور نجات اسی میں تھی کہ گاؤں سے بھاگ جاتے۔ یہی منشا اُن کے مالکوں کا تھا۔

عاشو نے مجھے بتایا کہ ایک روز وہ اور اُس کا خاوند گاؤں سے نکلے اور اس شہر میں آ گئے۔ شہری حضرات یہ سُن کر شاید حیران ہو جائیں کہ ان کا تمام سامان ایک گٹھڑی تھی اور ٹین کا ایک سُوٹ کیس۔ وہ اس شہر میں پانچ چھ دن خراب ہوتے۔ فٹ پاتھ پر راتیں گزاریں پھر انہی جیسا ایک آدمی انہیں ایک کچی آبادی میں لے گیا اور پندرہ روپے ماہوار کرائے پر ایک جُھگی دلا دی۔ یہ مٹی کی دیواروں کا ایک کمرہ تھا۔ اس پر پُرانے ٹین کی چھت اور اُوپر سرکنڈے تھے۔ اس میں میاں بیوی سما سکتے تھے۔

خاوند دیہاڑیوں پر مزدوری کرنے لگا اور قسمت عاشو پر اس طرح مہربان ہوئی کہ گھروں میں کام کرنے والی ایک عورت اُسے اپنے ساتھ لے گئی اور ایک گھر میں اُسے نوکری دلا دی۔ عاشو کا جسم چھریرا سا تھا شکل و صورت بھی ذرا اچھی ہی تھی اس لئے اُسے فوراً نوکری مل گئی۔ اس گھر کا آدمی کپڑے کا تھوک کا بیوپاری تھا۔ بہت بڑی دکان تھی۔

میں بات مختصر کرتا ہوں۔ عاشو خوش تھی کہ اب اُس کی زندگی باعزت ہو گئی ہے لیکن خوشی زیادہ دن نہ رہی۔ اُس کا خاوند بیمار ہو گیا۔ پسلیوں میں دَرد رہتا تھا اور اُسے بخار تھا۔ ایک حکیم جس کی دکان کچی آبادی کے ساتھ ہی تھی، دوائی دیتا رہا۔ چار پانچ دنوں میں ہی اُس کی حالت بہت بگڑ گئی۔ اُسے چارپائی پر ڈال کر ایک ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ ڈاکٹر نے دیکھ کر کہا کہ اسے مار کر میرے پاس لاتے ہو۔ اسے نمونیہ ہے۔

ڈاکٹر نے ایک انجکشن دیا۔ دوائیاں لکھ دیں اور کہا کہ کسی ہسپتال میں داخل کرا دو لیکن ہُوا یہ کہ چارپائی اُٹھا کر واپس لاتے تو وہ مر چکا تھا۔

عاشو اکیلی رہ گئی اور اس گھر میں نوکری کرتی رہی۔ اُس کی عمر ابھی پینتیس چھتیس سال تھی۔ جسم اچھا اور صحت اچھی تھی۔ اُسے شادی کے مشورے دیئے گئے جو اُس نے قبول نہ کئے۔ جس گھر میں وہ نوکری کرتی تھی وہ اُسے پسند

کیا جانے لگا اور اس پر اعتبار بھی کرنے لگے۔ عاشو صبح سے شام تک وہاں کام کرتی اور رات اپنی جھگی میں گزارتی تھی۔ گھر کی مالکن نے اُسے کہا تھا کہ وہ دونوں بیٹیوں کی شادی سے فارغ ہو جائیں گے تو عاشو کو اُوپر والی منزل کا ایک کمرہ دے کر گھر میں رکھ لیں گے۔

ایک سال گزر گیا۔ دکان پر دکان کا نوکر دوپہر کی روٹی لے جایا کرتا تھا اور کبھی دس بارہ دنوں بعد نوکر کسی وجہ سے نہ آتا تو عاشو دکان پر روٹی دے آتی تھی۔ ایک روز وہ روٹی دینے گئی تو کپڑا مارکیٹ میں اُسے قاتل بھائیوں کے باپ اور چچا نے دیکھ لیا۔ یہ دونوں کپڑے خریدنے آتے ہوں گے۔ اُنہوں نے عاشو کو اپنے مالک کی دکان میں جاتے دیکھا تھا۔ یہ دونوں دکان میں چلے گئے۔ مالک نے عاشو سے کہا کہ وہ کھانا اندر رکھ کر چلی جاتے۔ عاشو اپنے سابقہ گاؤں کے ان دو آدمیوں کو دیکھ کر بہت گھبراتی۔

مالک نے ان دونوں کو گاہک سمجھ کر ان کی آؤ بھگت کی۔ اُنہوں نے کہا کہ وہ کچھ لینے نہیں آتے، کچھ پوچھنے اور کچھ بتانے آتے ہیں۔ انہوں نے عاشو کے بارے میں پوچھا کہ یہاں کیا کر رہی ہے۔ دکان کے مالک نے بتایا کہ اُس کے گھر کی نوکرانی ہے۔ اُنہوں نے عاشو کے سامنے یہ باتیں کیں۔

"اسے آج ہی گھر سے نکال دیں ورنہ آپ نقصان اُٹھائیں گے" ——
قاتل بھائیوں کے باپ نے کہا —— "اسے اور اس کے خاوند کو ہم نے اپنے گاؤں سے نکال دیا تھا۔ ان دونوں کو ہم نے اپنے گھروں میں پالا۔ اچھے سے اچھے کپڑے دیتے۔ ہر ضرورت پوری کی لیکن ان دونوں نے ہمارے دشمنوں سے پیسے لے کر میرے دو بے گناہ بیٹوں کو عمر قید دلا دی۔ پولیس ان کے ساتھ ملی ہوتی تھی۔ تب پتہ چلا کہ یہ عورت شریف گھروں کی جوان لڑکیوں کو ورغلاتی اور بداخلاق آدمیوں سے پیسے لے کر لڑکیوں کو ان سے ملواتی رہتی ہے۔ یہ سخت مکّار اور جھوٹی عورت ہے۔ اس پر ایک پیسے کا اعتبار نہ کرنا۔ آپ روپے پیسے والے بھی ہیں اور عزت والے بھی۔"

عاشو سب چپ چاپ سنتی رہی اور یہ دونوں آدمی بڑھ بڑھ کر جھوٹ

بولتے رہے۔ میں اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ عاشو کو کیوں چپ لگ گئی تھی۔ اس دربے کے لوگ پیدا ہونے کے بعد ہوش میں آتے ہیں تو دیہات کے دیوتاؤں کی خدمت بلکہ عبادت کرنے لگتے ہیں۔ ان کے دماغوں پر اور اُن کی روحوں پر آقاؤں کا رعب سوار ہوتا ہے۔ وہ ان آقاؤں کو سارے ملک کے بادشاہ سمجھتے ہیں۔

عاشو بھی ان لوگوں کی جوتیوں میں پلی اور بڑی ہوئی تھی۔ اس پر ان کا جو رعب طاری رہتا تھا، اس لئے اُسے یہ بھی نہ کہنے دیا کہ یہ دونوں آدمی جھوٹ بولتے ہیں۔ اُس نے یہ سوچ لیا تھا کہ شام کو اس کا مالک گھر آئے گا تو وہ اُس کی بیوی کے سامنے بتائے گی کہ اصل واقعہ کیا ہے۔

وہ آدمی ابھی گئے نہیں تھے۔ عاشو کے مالک نے اُسے اتنا ہی کہا کہ وہ گھر چلی جائے۔ وہ گھر گئی تو ان لوگوں کے مہمان آئے ہوتے تھے۔ مہمان نہ ہوتے تو عاشو مالکن کو بتا دیتی۔ مہمانوں کے سامنے وہ نہ بول سکی۔ شام کو مالک روزمرہ کے وقت سے پہلے گھر آگیا۔ مہمانوں کے سامنے ہی اس نے عاشو کو بلا کر اپنی بیوی کو بتانا شروع کر دیا کہ عاشو جس گاؤں کی رہنے والی ہے وہاں کے دو معزز اشخاص کیا بتا گئے ہیں۔ اُس نے قاتل بھائیوں کے باپ اور چچا کا ہر لفظ اپنی بیوی اور مہمانوں کو سنایا۔

"اس کی شکل دیکھو" ـــــ اُس نے عاشو کی طرف دیکھ کر کہا ـــــ "بالکل یتیم اور مسکین لگتی ہے لیکن ہے میسنی۔ کرتوت دیکھو۔ گاؤں والوں نے اسے ٹھیک دلیس نکالا دیا ہے"

"میں بھی سوچتی تھی کہ جب بھی میں ٹرنکوں والے کمرے میں جاتی ہوں، یہ میرے پیچھے پیچھے کیوں آجاتی ہے" ـــــ گھر کی مالکن نے کہا ـــــ "یہ بھید لیتی پھرتی تھی کہ کون سے ٹرنک میں کیا رکھا ہے"

"چوریاں ایسے ہی گھر بھیدی کرایا کرتے ہیں" ـــــ ایک مہمان بولا ـــــ "چھٹی کرا دو جی اس کی۔ اللہ نے آپ کو بچا لیا ہے"

"اس کی آنکھیں بتاتی ہیں کہ اصل چلتر ہے" ـــــ مالکن نے کہا ـــــ

"جا چلی جا۔ کل سے یہاں نہ آنا۔"

"بی بی جی!" ——— عاشو نے روتے ہوئے کہا ——— "ایک سال سے دو دو مہینے اوپر ہو گئے یہاں کام کرتے۔ میری کسی بات پر، کسی حرکت پر انگلی رکھیں۔ میں نے آپ کو کوئی دھوکہ فریب دیا ہے؟"

"پتہ نہیں باہر تیرے لچھن کیا ہیں" ——— مالکن نے کہا ——— "جا، شکل گم کر۔"

عاشو نے اپنی تنخواہ مانگی۔ مالک نے دن گنے اور حساب کر کے پیسے عاشو کو دیتے نہیں بلکہ اُس کی طرف پھینکے اور "جا، دفع ہو" کہہ کر اُسے رخصت کر دیا۔ عاشو کو اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع ہی نہ ملا۔

ہر کوئی سمجھ سکتا ہے کہ اس غریب اور مجبور عورت کو کتنا افسوس ہُوا ہوگا۔

اب اُسے پھر نوکری کی تلاش شروع ہوئی۔ تین مہینوں بعد ایک عورت اُسے ایک گھر میں لے گئی۔ ان لوگوں کو بچوں کے لئے ایک عورت کی ضرورت تھی۔ یہ میاں بیوی دونوں ہی وہمی تھے یا محتاط تھے۔ انہوں نے عاشو سے پوچھا کہ اُس نے پہلے کہیں نوکری کی ہے؟ اُس نے بتایا کہ فلاں محلے میں فلاں کے گھر ایک سال نوکری کی ہے لیکن انہوں نے جواب دے دیا ہے۔ اس سے پوچھا کہ جواب کیوں دیا ہے تو عاشو نے کہا کہ کسی وجہ کے بغیر ہی اس پر شک کرتے تھے۔

"نہیں مائی نہیں" ——— اس گھر کے مالک نے کہا ——— "ہم ایسی عورت کو نہیں رکھ سکتے جسے پہلے کسی شک پر جواب ملا ہُوا ہو۔"

عاشو کو کبھی کسی دکان پر کوئی ایک دو دنوں کے لئے کام مل جاتا۔ کچھ مہینے مرچ مسالہ پیسنے پر ایک تھوک دکاندار کا کام کرتی رہی۔ اس دوران دو عورتیں اُس کے لئے کوئی گھر تلاش کرتی رہیں اُسے دو گھروں میں لے جایا گیا۔ دونوں نے اُسے صرف اس وجہ سے نہ رکھا کہ وہ ایک گھر سے نکالی ہوئی تھی۔

ایک سال بعد اُسے گھر مل گیا۔ وہاں اُس نے جھوٹ بولا کہ اُس نے پہلے کہیں بھی نوکری نہیں کی۔ ان لوگوں نے اس کا کام دیکھ کر اسے بہت پسند کیا۔ یہاں اس نے آٹھ نو مہینے گزار دیتے اور ایک روز اُس کا "جرم" یہاں بھی

مالکن، کپڑے کے بیوپاری کی بیوی آگئی۔ وہ ماتم پر آتی تھی۔ اُس کی جان پہچان یا رشتہ داری اس عورت یا اس آدمی کے ساتھ تھی جن کی یہ نوکر تھی۔

اس عورت نے عاشو کو دیکھتے ہی اس کے خلاف بولنا شروع کر دیا۔ اس پر ہر الزام عائد کیا اور اُسے اس گھر سے نکلوا دیا۔ یہاں بھی عاشو نہ بولی۔ وہ اپنی زبان سے یہ کہنے سے ڈرتی تھی کہ اُس نے دو قاتلوں کی نشاندہی کی تھی اور ان کے خلاف عدالت میں گواہی دی تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ عدالت میں گواہی دینا اچھا نہیں ہوتا۔ دیہات کے لوگ اسے کچہری چڑھنا کہتے ہیں اور اسے بہت بُرا فعل سمجھتے ہیں۔

عاشو کا دل ٹوٹ گیا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ اُس کے دماغ میں یہ بھی آتی تھی لوگوں کو بُری بن کر دکھا دے۔ چوریاں کرے اور ہر بُرا کام کرے۔ اُس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ جس آدمی نے اُسے پندرہ روپے ماہوار پر ڈربے جیسی جُھگی دی ہوتی تھی، اُس نے عاشو پر بُری نیت صاف لفظوں میں تو ظاہر نہیں کی تھی لیکن عاشو اُس کے اشارے سمجھتی تھی۔ اس شخص نے عاشو کو یہ بھی کہا تھا کہ وہ اس جُھگی میں مفت رہ سکتی ہے۔ وہ اس پر مہربانیاں کرتا رہتا تھا لیکن عاشو اپنے مرے ہوئے خاوند کو دل سے نہیں اتارتی تھی۔ اُس نے قسم کھائی ہوئی تھی کہ اپنی عزت کو خراب نہیں کرے گی۔

بدبختی کا ایسا وقت شروع ہوگیا کہ دیہاڑی پر بھی کام ملنا بند ہوگیا۔ جُھگی کے پندرہ روپے تو ہر مہینے پورے کرنے ہی تھے۔ اس نے گھروں میں نوکری تلاش کرنے کا خیال دماغ سے نکال دیا۔ ایسا وقت آگیا کہ اُس کے پاس نہ آٹا رہا نہ پیسے۔ اُس نے ایک دن کا فاقہ کر لیا، اگلے دن برداشت جواب دے گئی۔ جُھگیوں میں سب لوگ غریب تھے پھر بھی دو گھروں سے ایک ایک روٹی اور ایک گھر سے دال مل گئی۔

تین چار روز اس طرح گزارہ چلا اور عید آگئی۔ وہ ایک مسجد کے سامنے بیٹھے ہوئے گداگروں میں جا بیٹھی۔ لوگ عید پڑھ کر نکلے تو گداگروں کے آگے پیسے پھینکتے گئے۔ عاشو کو وہاں سے چھ روپے اور کچھ پیسے مل گئے۔ مسجد سے

ہٹ کر وہ گھروں میں گداگری کے لئے گئی۔ عید کا دن تھا اس لئے شام تک اُسے سولہ سترہ روپے مل گئے۔ دو تین گھروں سے کھانے کو بھی کچھ مل گیا۔

اس عید نے اُسے پکا گداگر بنا دیا۔ وہ گھر سے نکل جاتی اور دُور دُور آبادیوں میں چلی جاتی۔ اُس کی روزانہ آمدنی پانچ سے دس روپے تک ہو جاتی تھی۔ اُس نے مجھے بتایا کہ آمدنی تو اُس کی بہت تھی لیکن وہ گداگری کو پسند نہیں کرتی تھی۔ جب وہ دیکھتی کہ سات آٹھ دنوں کے لئے پیسے کافی ہو گئے ہیں تو وہ سات آٹھ دن چھٹی کرتی تھی۔

اُس پر ہر وقت یہ ڈر سوار رہتا تھا کہ جن قاتل بھائیوں کی اُس نے نشاندہی کی تھی، اُن کے خاندان کا کوئی نہ کوئی آدمی اُسے دیکھ لے گا اور اُس کے ہاتھوں وہ قتل ہو جائے گی۔ وہ رات کو اکیلی ہوتی تھی اور ڈرتی رہتی تھی۔

اُسے دنوں، مہینوں اور سالوں کا کچھ پتہ نہیں تھا کہ کتنے گزر گئے ہیں۔ یہ حساب میں نے کیا تھا کہ جس روز وہ مجھے ملی، قتل کی واردات اس سے تقریباً پانچ سال پہلے ہوئی تھی۔ اُس نے تقریباً ڈیڑھ سال پہلے کا واقعہ سنایا۔ وہ ایک آبادی میں گئی جس میں بڑے افسروں، جاگیرداروں اور دولت مندوں کی کوٹھیاں ہیں۔ میری تعیناتی اسی علاقے کے تھانے میں تھی۔

عاشو اس آبادی میں کئی بار گئی تھی۔ ایک روز اس کے اُس حصے میں چلی گئی جس میں وہ پہلے کبھی نہیں گئی تھی۔ وہ ایک کوٹھی کے پھاٹک میں داخل ہو گئی۔ اُس نے دائیں طرف نہ دیکھا۔ ادھر لان تھا اور سامنے برآمدہ تھا۔ وہ آگے دیکھ رہی تھی۔ ذرا آگے گئی تو اُسے پیچھے کسی نے بلایا ——— "ادھر آجا ماتی!"

اُس نے پیچھے دیکھا وہاں ایک بڑی ہی خوبصورت لڑکی گھاس کے لان میں کھڑی تھی۔ عاشو نے لڑکی کو دیکھا تو اسے چکر آ گیا۔ اُس کے جسم سے جان نکل گئی۔ لڑکی اُسے دیکھ کر حیران ہو رہی تھی۔ عاشو وُہں کھڑی تھی۔ لڑکی جس کی عمر چوبیس پچیس سال تھی، اُس کی طرف چل پڑی اور اُس سے پوچھا کہ تم عاشو ہو؟

"مجھے بخش دو ناظراں بی بی!" ——— عاشو نے ہاتھ جوڑ کر کہا ——— "پھر کبھی ادھر نہیں آؤں گی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ تمہارا گھر ہے۔"

"ڈر کیوں گئی ہو پگلی!"— اس لڑکی نے اُسے کہا جس کا نام ناظراں تھا۔

ناظراں اُن دو بھائیوں کی بہن تھی جو عاشو اور اُس کے خاوند کی نشاندہی پر قتل کے جرم میں پکڑے گئے اور عمر قید بھگت رہے تھے۔ عاشو نے مجھے بتایا کہ وہ دو بھائی آپس میں سگے تھے اور ناظراں ان کی سوتیلی بہن تھی۔ ناظراں عاشو کو نہیں بخش سکتی تھی لیکن وہ عاشو کو پیار سے بلا رہی تھی۔ اُس نے پیار سے عاشو کو لان میں بٹھا لیا اور اُس سے پوچھا کہ گاؤں سے نکل کر وہ اپنے خاوند کے ساتھ کہاں چلی گئی تھی۔

عاشو نے ڈرڈر کر ناظراں کو بتایا کہ اُس پر کیا بیتی ہے۔ عاشو نے جو باتیں مجھے سنائی تھیں یہ ساری کی ساری ناظراں کو سُنا دیں۔ اُس کے باپ اور چچا کی بھی سنائی کہ انہوں نے اُسے پہلے گھر کی نوکری سے کس طرح نکلوایا تھا۔

"اب میں بیوہ ہوں ناظراں بی بی!"— عاشو نے روتے ہوئے کہا— "گداگری کرتی ہوں۔ مجھے اور کتنی سزا دو گے تم لوگ؟ میرے اوپر بہت ظلم ہو چکا ہے۔ میرے بس میں ہو تو میں تمہارے بھائیوں کی جگہ خود عمر قید بھگتنے جیل خانے میں چلی جاؤں۔ اب لگتا ہے کہ میری موت تمہارے خاندان کے کسی آدمی کے ہاتھ سے آئے گی۔"

"آج سے تمہاری گداگری ختم ہے"— ناظراں نے کہا— "تم باقی عمر میرے ساتھ گزارو گی۔"

"نہیں"— عاشو نے ڈرتے اور تڑپتے ہوئے کہا— "مجھے جانے دو۔ میں جس طرح گاؤں سے بھاگ آئی تھی اس طرح اس شہر سے بھی بھاگ جاؤں گی، یا یہ وعدہ کرو کہ تم مجھے فوراً مروا دو گی۔ اس جہنم سے چھوٹ ہی جاؤں تو اچھا ہے۔"

ناظراں کو تو میں اچھی طرح جانتا تھا۔ میں نے اسے شاملِ تفتیش کیا تھا۔ اسے پورا دن اپنے سامنے بٹھا کر رکھا تھا۔ آپ نہیں سمجھ سکتے کہ وہ کتنی خوبصورت لڑکی تھی۔ اُس نے اپنا دل کھول کر میرے آگے رکھ دیا تھا۔ میں آپ کو قتل کی

یہ واردات مختصر سی سنا دیتا ہوں۔ اپنی تفتیش کی ساری باتیں نہیں سناؤں گا۔

ناظراں کے گاؤں کا ایک بڑا خوبصورت اور جوان آدمی گاؤں سے ذرا دُور ایک ویران جگہ قتل ہو گیا۔ لاش صبح کسی نے دیکھی اور تھانے میں مجھے رپورٹ دی گئی۔ مقتول کی عمر پچیس سال کے لگ بھگ تھی اور اُس کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ اُسے کلہاڑیوں سے قتل کیا گیا تھا۔

میں نے تفتیش شروع کی تو مجھے پتہ چلا کہ یہ تو بڑی مشکل تفتیش ہے۔ قاتلوں کے کھُروں کے سوا کوئی اور سراغ نہیں تھا اور کوئی اشارہ بھی نہیں ملتا تھا۔ مقتول کی کسی کے ساتھ ذاتی یا خاندانی دشمنی نہیں تھی۔ ہر کوئی اُس کی تعریف کرتا تھا۔ اُس کا چال چلن اور اخلاق بہت اچھا بلکہ پاک اور صاف بتایا جاتا تھا۔ اُس کی برادری کے جن گھروں میں لڑکیاں تھیں وہ اُس کے رشتے کے خواہشمند تھے لیکن وہ قبول نہیں کرتا تھا۔ ان میں ایک سے ایک بڑھ کر حسین لڑکی تھی۔ سب حیران تھے کہ وہ کیوں اپنے رشتے کا کوئی فیصلہ نہیں کرتا۔

ایسے آدمی کا قتل ہو جانا حیران کر دینے والا واقعہ ہوتا ہے۔ اُس کا کسی کے ساتھ جائداد کا تنازعہ بھی نہیں تھا۔ کسی بدمعاش یا مشکوک آدمی یا عورت کے ساتھ اُس کی دوستی نہیں تھی۔ پندرہ دن گزر گئے اور میں کسی نتیجے پر نہ پہنچا۔ مقتول کا باپ مر چکا تھا۔ اُس کا ایک چچا تھا جس نے مجھے کہا کہ وہ مقتول کی ماں کی طرف سے گورنر کو درخواست بھیجے گا کہ پولیس قاتل پارٹی کے ساتھ ملی ہوئی ہے اور تھانیدار جان بوجھ کر تفتیش میں کوتاہی کر رہا ہے۔

میں نے اُسے سمجھایا اور کہا کہ وہ کسی کی طرف اشارہ کر سکے کہہ دے کہ اس آدمی پر شک ہے۔ پھر دیکھے کہ میں کیا کرتا ہوں لیکن وہ کوئی شک نہیں بتاتے تھے۔ میں ان سب سے مقتول کے بارے میں پوچھ چکا تھا اور اِن سے مجھے کوئی اشارہ نہیں ملا تھا۔

مقتول کی دو بہنیں تھیں۔ میں نے ان دونوں سے بھی پوچھا تھا۔ ایک بار پھر مجھے خیال آیا کہ ان سے مزید کچھ پوچھوں۔ میں نے دونوں کو اکھٹے بٹھا کر کہا کہ وہ دماغ پر اور زیادہ زور ڈالیں۔ ہو سکتا ہے انہیں کوئی بات یاد آجاتے۔

انہوں نے باتیں کیں، میں نے بھی کیں اور پوچھیں اور اس مسئلے پہ باتیں ہونے لگیں کہ مقتول شادی کیوں نہیں کرتا تھا اور کیا وہ کسی اور لڑکی کو پسند کرتا تھا؟

مقتول کی بڑی بہن نے کہا کہ وہ اور اُس کی دوسری بہن اُس کے پیچھے لگی رہتی تھیں کہ وہ شادی کر لے یا اپنی پسند بتاتے۔ مقتول نے تین چار مرتبہ ایک لڑکی کا نام لیا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا تھا کہ وہ تو کسی اور کی منگیتر ہے .... یہ لڑکی ناظراں تھی .... بہنیں کہتی تھیں کہ اُن کا بھائی ایسا آدمی نہیں تھا کہ کسی کی منگیتر کو گمراہ کرتا۔

بہنوں نے تو یہ کہہ دیا کہ اُن کا بھائی ایسا آدمی نہیں تھا لیکن میں ہر کسی کو اپنی نظر سے دیکھ رہا تھا۔ کوئی آدمی خواہ وہ کتنا ہی نیک ہو، فرشتہ نہیں ہوتا۔ میں نے ناظراں کے بارے میں پوچھنا شروع کر دیا۔ مجھے ایک اور اشارہ مل گیا۔ ناظراں مقتول کے گھر جاتی رہتی تھی اور مقتول کو دیکھ کر وہ کچھ اور ہی طرح خوش ہوتی تھی۔

میں تفتیش کی کہانی نہیں سُنا رہا اس لئے بات مختصر کر رہا ہوں۔ کسی کو غلط فہمی میں نہیں پڑنا چاہیئے۔ میں نے دوسرے لوگوں سے یعنی مخبروں وغیرہ سے معلوم کرنا شروع کر دیا۔ میں تو اب ایک ایک پتھر اور ایک ایک اینٹ اُٹھا کر دیکھ رہا تھا۔ مجھے چند اور اشارے مل گئے جن میں ایک یہ تھا کہ ناظراں کو اپنا منگیتر پسند نہیں تھا۔ مجھے ایک عورت نے مشورہ دیا کہ عاشو نام کی ایک عورت ہے جو مقتول اور ناظراں کے گھر میں کام کرتی ہے اور اس کا خاوند مقتول کے گھر کا نوکر ہے۔ ان دونوں سے شاید کوئی سراغ مل جائے۔

میں نے آپ کو بتایا ہے کہ یہ اونچی ذات کے اور بڑی زمینداری کے خاندان تھے۔ روپے پیسے کی بہتات تھی اور گاؤں پر انہی لوگوں کی حکومت تھی۔ مقتول کا بہت بڑا چوبارہ تھا اور اُس نے گاؤں کے ساتھ ہی کھیتوں میں دو کمروں کا ایک مکان بنایا ہوا تھا جس کے اردگرد چھوٹا سا باغیچہ تھا۔

میں نے عاشو اور اس کے خاوند کو تھانے بلایا۔ پہلے تو یہ کچھ بتاتے ہی

نہیں تھے۔ ڈرتے تھے اور ہاتھ جوڑتے تھے۔ بے چارے کب تک انکار کرتے۔ بتانے پر آتے تو منت سماجت کرنے لگے کہ میں کسی کو نہ بتاؤں کہ انہوں نے کچھ بتایا ہے۔ میں نے ان کے ساتھ وعدے کئے، حوصلہ افزائی کی تو عاشو نے بتایا کہ ناظراں مقتول سے ملتی ہے اور ملاقاتیں باغیچے والے مکان میں ہوتی ہیں۔ ان کے پیغام لانے اور لے جانے کا کام عاشو کرتی تھی۔ کبھی کبھی ان کی ملاقات رات کو بھی ہوتی تھی۔ عاشو کو یہ معلوم نہیں تھا کہ ان کے تعلقات پاک تھے یا ناپاک۔

عاشو کے خاوند نے بھی یہی بتایا کہ شام کے بعد مقتول کھیتوں کی طرف چلا گیا۔ کچھ وقت بعد ناظراں کے دونوں بھائی بھی کلہاڑیاں اٹھائے ہوئے اسی طرف جاتے دکھائی دیئے۔ رات ہو چکی تھی۔ چاندنی بڑی صاف تھی۔ دونوں باغیچے کے قریب سے گزرے تھے۔ عاشو کا خاوند ویسے ہی وہاں کھڑا تھا۔ وہاں اونچے پودے تھے۔ اس نے دونوں کو پہچان لیا۔ انہوں نے اسے نہ دیکھا۔

عاشو کے خاوند کو معلوم نہیں تھا کہ مقتول کیوں اُدھر گیا تھا۔ وہ مقتول کے انتظار میں کھڑا رہا۔ مقتول اُسے کہہ گیا تھا کہ وہ جلدی آئے گا۔ وہ تو نہ آیا، ناظراں کے بھائی آ گئے اور باغیچے کے قریب سے گزر گئے۔ مقتول ساری رات واپس نہ آیا۔ صبح اُس کی لاش کی اطلاع ملی۔ عاشو پانچ سال بعد مجھے بتا رہی تھی کہ اُسے اور اُس کے خاوند کو یقین تھا کہ قاتل ناظراں کے بھائی ہیں لیکن وہ زبان کھولنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔

میں نے تفتیش میں دونوں کی زبان کھلوا لی تھی۔ میں نے دونوں بھائیوں کو تھانے بلا کر الگ بٹھا لیا اور کچھ وقت بعد ناظراں کو تھانے بلایا۔ اس حسین لڑکی نے مجھے حیران کر دیا۔ میں نے پہلی بات اُس سے یہ کی کہ ایک خوبصورت جوان تمہارے پیچھے قتل ہو گیا ہے۔

"کیا تم بتا سکتی ہو قاتل کون ہے؟"

"میرے دونوں بھائی!" ——ناظراں نے کہا —— "آپ نے انہیں تھانے کیوں بلایا ہے؟"

"ابھی تو شک میں بلایا ہے" ___ میں نے کہا۔

"دونوں کو پھانسی لگا دو" ___ اُس نے کہا ___ "شک وشبہ نہ کرو۔ مجھ سے پوچھو۔ قاتل یہی ہیں"

اُس نے بیان تو لمبا دیا تھا لیکن میں سارا نہیں سناؤں گا۔ ناظراں اور مقتول کی آپس میں محبت تھی۔ ناظراں کی منگنی کسی اور کے ساتھ اُس وقت ہوئی تھی جب وہ گیارہ بارہ سال کی تھی۔ جوان ہو کر اُسے مقتول اچھا لگا اور منگیتر بُرا لگنے لگا۔ عاشو کے ذریعے مقتول اور ناظراں کی ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ وہ مقتول کے ساتھ محبت کو پاک کہتی تھی۔ اس سے میری کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ محبت کیسی تھی۔

ناظراں کے یہ بھائی سوتیلے تھے۔ وہ پانچ چھ مہینے کی تھی جب اس کی ماں مر گئی تھی۔ اس کے باپ نے دوسری شادی کر لی اور یہ دو بھائی پیدا ہوئے۔ واردات کے وقت ان میں سے بڑے بھائی کی عمر انیس سال اور چھوٹے کی سترہ سال تھی۔ ناظراں کے ساتھ سوتیلی ماں کا سلوک اچھا نہیں تھا۔ اس وجہ سے بھائی بھی ناظراں کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔

ایک روز اُنہوں نے ناظراں کو مقتول کے باغیچے والے مکان سے نکلتے دیکھ لیا۔ گھر آکر اُنہوں نے ناظراں کو مارا پیٹا۔ ناظراں پھر بھی مقتول سے ملتی رہی۔ حیرت اس پر ہے کہ گاؤں میں کسی کو پتہ نہ چلا کہ ناظراں اور مقتول کی آپس میں محبت اور در پردہ میل جول ہے۔ ایک روز مقتول نے ناظراں کو بتایا کہ اُس کی اُس کے بھائیوں کے ساتھ زبانی کلامی لڑائی ہوئی ہے۔ دونوں بھائی نوجوان اور نادان تھے۔ وہ جوش میں آگئے۔ دو روز بعد مقتول قتل ہو گیا۔

ناظراں کو معلوم نہیں ہو سکا کہ کس وقت اُس کے بھائی کلہاڑیاں لے کر گھر سے نکلے تھے اور کس وقت واپس آئے تھے۔ اُس نے خون آلود کپڑے بھی نہیں دیکھے۔ اُس نے اپنے بھائیوں کی بعض باتیں سنائیں جو انہوں نے قتل کے بعد کی تھیں۔ یہ سُن کر مجھے ان پر پکا شک ہو گیا۔ میں نے ناظراں کو گھر بھیج دیا اور اس کے دونوں بھائیوں کو گرفتار کر لیا۔

سب سے پہلے تو ان کے کھُرے دیکھے۔ یہ موقعہ واردات والے کھُرے تھے۔ وہ نہیں مانتے تھے۔ میں نے رات لگا کر منوا لیا۔ گاؤں لے جا کر ان کے گھر کی تلاشی لی اور دونوں کلہاڑیاں اور واردات کے وقت کے کپڑے برآمد کیے۔ مختصر یہ کہ انہوں نے بیان دے دیئے۔ میں نے اُن سے پوچھا تھا کہ انہیں قتل کا موقع کس طرح ملا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ اپنے ایک دوست کو انہوں نے کہا ہُوا تھا کہ مقتول جب کبھی گاؤں سے دُور چلا جائے تو وہ انہیں بتائے۔ وہ خود بھی دیکھتے رہتے تھے۔ اتفاق سے ان کے دوست نے مقتول کو جاتے دیکھا تھا۔ اُس نے دونوں بھائیوں کو بتا دیا۔ دونوں اُس کے پیچھے گئے۔ مقتول ایک جگہ کھڑا کچھ کر رہا تھا۔

ناظراں جب مجھے بیان دے رہی تھی تو میں نے کہا تھا کہ یہ کسی کو بھی معلوم نہیں کہ مقتول شام کے بعد باہر کیوں گیا تھا۔

"صرف مجھے معلوم ہے" ناظراں نے کہا ۔۔۔ "یہ منگل کی رات تھی۔ کسی نے اُسے ایک ٹونہ بتایا تھا جو تین منگل کی راتیں کرنا تھا۔ بتانے والے نے کہا تھا کہ وہ یہ ٹونہ پورا کرے تو اُس کی شادی میرے ساتھ ہو جائے گی۔ وہ ٹونہ کرنے گیا تھا"

میں نے عاشو اور اُس کے خاوند کو گواہ بنا لیا۔ ناظراں کی گواہی ضروری تھی لیکن اس ڈر سے اُسے گواہ نہ بنایا کہ اُس کا باپ اسے گمراہ کر دے گا اور مقدمہ ناکام ہو جائے گا۔ اس کے بغیر قتل کا باعث ثابت نہیں ہوتا تھا لیکن میں نے ثابت کر لیا تھا۔ دونوں بھائیوں کو سزائے موت ملتی لیکن ان کی نوعمری کی وجہ سے انہیں عمر قید دی گئی۔

میرا کام تو یہیں ختم ہو گیا۔ سات آٹھ مہینوں بعد مجھے ایک اور دیہاتی تھانے میں تعینات کر دیا گیا۔ کچھ عرصے بعد مجھے شہر کا یہ تھانہ دیا گیا جہاں عاشو مجھے مقدمے کے بعد کا قصّہ سنا رہی تھی۔ قاتلوں کا خاندان انہیں کہتا تھا کہ وہ عدالت میں گواہی نہ دیں۔ انہوں نے مجھے بتایا تھا اور میں نے قاتلوں کے باپ کو دھمکی دی تھی کہ کسی نے گواہوں کو توڑنے کی کوشش کی تو میں ۹ سے

گرفتار کر لوں گا۔

عاشو اور اس کے خاوند کو ان لوگوں نے جو سزا دی وہ میں سنا چکا ہوں۔ اب اُس نے مجھے سنایا کہ گاؤں سے نکلنے کے اتنا عرصہ بعد ناظراں شہر کی اس کوٹھی میں مل گئی۔ اُسے یقین تھا کہ ناظراں اُس سے اپنے بھائیوں کی سزا کا انتقام لے گی۔ عاشو کو معلوم نہیں تھا کہ ناظراں نے خود مجھے کہا تھا کہ قاتل اُس کے بھائی ہیں اور انہیں پھانسی دلاؤ۔

ناظراں نے عاشو کو اپنے پاس رکھ لیا اور اسے بتایا کہ وہ تو بہت خوش ہے کہ اُس کے سوتیلے بھائیوں کو عمر قید ملی ہے۔ اُنہوں نے اُس کی محبت کو قتل کر دیا تھا۔ عاشو کو اعتبار آگیا۔ وہ اس کوٹھی میں نوکرانی لگ گئی اور جب وہ مجھے ملی اُسے اس کوٹھی میں ڈیڑھ سال ہو گیا تھا۔ اُس نے صاف اور اچھے کپڑے پہنے ہوتے تھے اور وہ معزز عورتوں کی طرح باتیں کرتی تھی۔

ناظراں شہر کی اس کوٹھی تک جس طرح پہنچی، عاشو نے یہ بھی سنایا۔ اپنی بات اُسے ناظراں نے سنائی تھی جو اس طرح ہے کہ اس کے دونوں بھائی پکڑے گئے تو یہ بات کھل گئی کہ مقتول اور ناظراں کے تعلقات تھے۔ اس کا پہلا اثر یہ ہوا کہ ناظراں کی منگنی ٹوٹ گئی۔ دوسرا اثر یہ کہ اُس کی سوتیلی ماں نے اُس کا جینا حرام کر دیا۔ اُس کے پیچھے اس عورت کے دو بیٹے سزا پا گئے تھے۔ باپ نے بھی ناظراں کے ساتھ بُرا سلوک شروع کر دیا۔ ناظراں نے خودکشی کا ارادہ کر لیا تھا لیکن اُس کی خالہ نے اُسے سہارا دیا اور اُس کے باپ سے پوچھ کر اُسے اپنے گھر لے گئی۔

کسی اور گاؤں کا ایک بڑا امیر آدمی تیسری بیوی کی تلاش میں تھا۔ وہ دو بیویوں کو اولاد نہ ہونے کی وجہ سے طلاق دے چکا تھا۔ اس کی عمر چالیس سال کے قریب تھی اور ناظراں تیئیس سال کی ہو چکی تھی۔ اپنے گاؤں میں ناظراں کو کوئی گھر قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ کسی کی معرفت اس آدمی کی بات چیت ناظراں کے لئے اُس کے خالو پھر اُس کے باپ کے ساتھ ہوتی اور بات پکی کر دی گئی۔ ایک دو مہینوں بعد شادی ہو گئی۔

ناظراں کو پناہ مل گئی۔ اُس نے پرواہ نہ کی کہ اُسے بڑی عمر کا خاوند ملا ہے۔

خاوند کا کچھ کاروبار شہر میں بھی تھا۔ وہ ناظراں کو شہر میں اپنی کوٹھی میں لے آیا۔ ناظراں کی خوبصورتی نے اُس آدمی پر جادو کر دیا۔ ناظراں نے خاوند کو بتایا کہ مقتول کے ساتھ اُس کا میل جول پاکیزہ تھا۔ بہرحال خاوند نے اس کی طرف توجہ ہی نہ دی۔

شادی کے دو سال بعد ناظراں نے خاوند کو ایک بیٹا پیدا کر دیا۔ پھر عاشو کی موجودگی میں ناظراں کی ایک بیٹی پیدا ہوئی۔ اُس نے اپنے گاؤں اور اپنے رشتہ داروں سے تعلق توڑ لیا تھا۔

میں نے عاشو سے مذاق کے لہجے میں پوچھا — "کیا یہ دونوں بچے ناظراں کے اپنے خاوند کے ہیں؟ تم تو اُس کی راز دار ہو۔"

"تھانیدار صاحب جی!" — اُس نے کہا — "اتنی ذلیل ہو کر اور دَر دَر بھیک مانگ کر اللہ نے میرے دن پھیرے ہیں اور تم پھر مجھ سے راز کی باتیں پوچھ رہے ہو۔" — وہ مسکراتی اور آہستہ سے بولی — "اُس کے خاوند کو اولاد کی ضرورت تھی۔ تم خود سیانے ہو۔ دو بیویوں سے اولاد نہ ہو تو مرد بدنام ہو جاتا ہے۔ لوگ باتیں بناتے ہیں۔ ناظراں نے اُس کی عزت رکھ لی ہے۔ تم مجھ سے اُلٹی اُلٹی باتیں نہ پوچھو نا!"

۶ طُوفانی راتیں

طوفانی ہواؤں کے زنّاٹے اور سمندر کی بپھری ہوتی موجوں کے پہاڑ پاکستان کے ایک بحری جہاز کو کاغذ کے پُرزے کی طرح پٹخ رہے تھے۔ بحری زندگی میں ایسی خوفناک راتیں یوں تو پہلے بھی آتی تھیں لیکن اس رات موسم کچھ زیادہ ہی غضب ناک ہوگیا تھا۔ ہر طرف سے بڑھتی ہوتی مشتعل موجوں کا قیامت خیز شور تھا۔ تند ہواؤں کی پُراسرار چیخیں جہاز میں دہشت پھیلا رہی تھیں۔ سمندر کی زندگی میں ایسے طوفان کوتی نئے اور انوکھے نہیں ہوتے۔ جہاز ران، ان سے نمٹنا خوب جانتے ہیں مگر وہ طوفان؟ —— طوفانِ نوحؑ سے کم نہ تھا۔ ملاح کہا کرتے ہیں کہ خاموش اور مرے مرے سمندر میں جہاز رانی کا کوتی لطف نہیں آتا مگر اُس روز کپتان کی زندگی کی سب سے بڑی غلطی نے اس کے پاؤں اکھاڑ دیتے۔ یوں لگتا تھا جیسے سمندر اسے اس کی لغزش کی سزا دے رہا ہو۔ غلطی یوں ہوتی کہ جوش میں آکر اس نے ایک ایسا ٹیڑھا راستہ اختیار کر لیا جس پہ کوتی بندرگاہ نہیں پڑتی تھی۔ اُوپر سے طوفانی ہواؤں نے آلیا۔ یہ غلطی دراصل ایک کارنامہ تھا۔ کارنامہ یوں کہ یہ تجارتی جہاز پہلی مرتبہ ایک بہت بڑی تجارتی مہم پر روانہ ہو رہا تھا۔ ایک ملک اپنی کاریں دوسرے ملک کو بھیج رہا تھا۔ یہ جہاز ایک تیسرے ملک کا تھا۔ اس مہم کی کامیابی پر اس جہاز کی کمپنی اور اس کے ملک کی نیک نامی کا دارومدار تھا۔ اس کے مقابلے میں ایک اور پرانی تجارتی بحری کمپنی کا جہاز بھی اسی مہم کا عزم کیے ہوتے تھا۔ یہ نیا راستہ منتخب کرنے والے جہاز کے کپتان نے اس بگڑتے ہوتے موسم میں خطرہ مول لے لیا اور ہوا کی تندی و تیزی برداشت کی اور منزلِ مقصود پر ان دونوں سے پہلے پہنچنے کے لیے جان کی بازی لگا گیا۔

۱۹۶۰ء کا موسم سرما تھا۔ یورپ کی سردی رگوں میں خون منجمد کر رہی تھی۔ پین اسلامک سٹیم شپ کارپوریشن کا "سفینۂ نصرت" جرمنی کی بندرگاہ ہیمبرگ سے فلوریڈا (امریکہ) جانے کے لئے تیار کھڑا تھا۔ اس پر جرمنی میں بنی ہوئی ۱۲۰۰ کاریں لدی ہوئی تھیں۔ کاریں بنانے اور برآمد کرنے والی ایک جرمن کمپنی نے یہ کاریں امریکہ بھیجنے کے لئے ایک پاکستانی تجارتی کمپنی کے جہاز اور بلجیم کی کسی کمپنی کے ایک جہاز سے معاہدہ کیا تھا۔

دونوں جہاز ایک ہی منزل کے لئے روانہ ہو رہے تھے۔ دونوں کا مقصد ایک ہی تھا لیکن پاکستانی جہاز کے کپتان این۔ ایچ، شاہ کو یہ عزم پریشان کئے ہوئے تھا کہ بلجیم کے جہاز سے پہلے منزل پر کیسے پہنچا جائے تاکہ پاکستان اور پاکستان کی ایک تجارتی بحری کمپنی کا نام بلند ہو۔ انہوں نے سوچ سمجھ کر عام راستے کی بجائے دوسری کوئی راہ ڈھونڈنے کی سوچی۔ یہ راستہ بحر اوقیانوس، بحر منجمد شمالی سے ہو کر فلوریڈا جاتا تھا۔ عام راستے کا فاصلہ جس سے بلجیم کا جہاز گیا کپتان شاہ والے رستے سے کم تھا لیکن اس زیادہ فاصلے والے رستے پر رکاوٹیں نہیں تھیں اور مسلسل سفر کے ذریعے جلد پہنچا جا سکتا تھا۔

اس عافیت کے رستے پر شاہ صاحب نے جہاز ڈال تو دیا لیکن ہیمبرگ سے آگے تین دن اور چار راتیں ہی سفر کیا تھا کہ سمندر کا مزاج برہم ہو گیا اور چند لمحوں بعد طوفانی لہریں اس عافیت کا راستہ تلاش کرنے والے جہاز کے پرخچے اڑانے کو بپھر گئیں۔ ساٹھ ساٹھ فٹ بلند موجوں کے پہاڑ جہاز کی طرف بھاگے چلے آ رہے تھے۔ جہاز میں خطرے کا الارم بجنے لگا۔ جہاز کے کپتان اُس وقت نیچے ظہر کی نماز ادا کرنے کے بعد معمول کے مطابق نیوی گیشن کا سبق پڑھا رہے تھے کہ ایک دم انہیں یوں محسوس ہوا کہ شدید زلزلہ آ گیا ہو۔ اس کے کیبن میں رکھے ہوئے صوفے ایک دم اِدھر سے اُدھر لڑھکنے لگے اور دیگر اشیاء اوپر تلے ناچنے کودنے لگیں۔ کپتان پر پہلے تو اچانک کچھ خوف سا طاری ہوا لیکن ساتھ ہی خیال آیا "میں کپتان ہوں۔" اور اسے اپنے کندھوں پر اس جہاز، اس پر سوار تمام زندگیوں اور ۱۲۰۰ انتہائی قیمتی کاروں کی سلامتی کا بوجھ محسوس ہوا۔ اس ذمہ داری

نے اسے بیدار کر دیا اور دل سے خوف جاتا رہا۔ اسی لمحے کیبن سے نکل کر کپتان برج پر پہنچا تو چھ دن اور چھ راتیں نیچے اترنا نصیب نہ ہُوا۔ آنکھ لگنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ایک ایک لمحہ طوفان سے لڑتے جھگڑتے گذرا۔ ہر لمحہ زندگی کا آخری لمحہ معلوم ہوتا تھا۔

این، ایچ شاہ خوف زدہ ہونے والا کپتان نہیں تھا۔ مگر اُس روز یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ اس کی زندگی کا آخری سفر تھا اور منزل سمندر کی تہہ بھتی۔ طوفان کبھی غصّے میں بھناتے ہوتے گینڈے کی طرح حملہ آور ہوتا اور کبھی دیو بھوت کی طرح جہاز کو اٹھا اٹھا کر سمندر پر پٹختا۔ کپتان جہاز کے برج پر کھڑا مشتعل سمندر کو دیکھ رہا تھا اور اس کا دماغ تیزی سے سوچ رہا تھا۔ جہاز قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ کپتان نے اپنے انجینئر کو حکم دیا "رفتار کم کر دو"۔ انجینئر نے فوراً رفتار کم کر دی۔

"کورس کا رُخ ایسا کر دو کہ ڈوبنے کا خطرہ نہ رہے"۔ کپتان کا یہ دوسرا حکم تھا۔ انجینئر نے فوراً تعمیل کی۔ رفتار کم ہو گئی بھتی۔ کورس کا رُخ بدل گیا تھا لیکن خطرہ کسی پہلو کم نہ ہُوا تھا۔ سمندر کا قہر و غضب بڑھ رہا تھا۔ عملے میں سراسیگی پھیلی ہوتی بھتی۔ پھر بھی سب، جہاز، اس کے سامان اور سواریوں کو بچانے کے لئے کسی نہ کسی طرح مصروف تھے۔ سب سے بدتر کیفیت سواریوں کی بھتی۔ کپتان مائیکروفون سے اپنے احکامات چلا چلا کر دے رہا تھا اور ساتھ ساتھ سمندروں اور زمینوں کے مالک، خدا تے بزرگ و برتر سے دعا بھی مانگ رہا تھا۔ "اس آزمائش سے مجھے کامیاب و کامران نکلنے کی ہمت عطا کر"۔

طوفان کے بے رحم تھپیڑوں اور موجوں کے قیامت خیز شور میں کپتان کی تھرتھراتی ہدایتیں بھی سنائی دے رہی بھتی اور وہ رہ رہ کر اپنے عملے کا حوصلہ بڑھا رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اپنے پروردگار کے حضور گڑگڑا رہا تھا۔ "اے ہمارے پالنے والے، اے مشکل کُشا، ہمیں ہمت دے کہ اس طوفان کا مقابلہ کر سکیں"۔

... رات گذر گئی، دن طلوع ہوا، پھر رات آ گئی۔ طوفانی ہوا کے جھکڑ اور تیز

ہو گئے۔ ہر سمت گھٹا ٹوپ اندھیرے ناچ رہے تھے۔ اس چیختی چنگھاڑتی تیرگی میں امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی تھی۔ کان کوئی آواز سنتے تھے تو وہ سمندری لہروں کا شور تھا۔ آنکھ دیکھتی تھی تو ہر طرف چھایا ہوا خوف ناک اندھیرا ـــــ یہ طوفان کی تیسری رات تھی۔ موسم کا مزاج دیکھ کر جہاز میں مایوسی پھیل گئی۔ سمندر بہت زیادہ غصے میں آگیا تھا۔ اب تو لگتا تھا کہ اس عذاب سے بخیر و عافیت نکلنے کی کوئی امید نہیں۔ برہم سمندر کو اُس وقت سکون آئے گا، جب وہ سب کچھ نگل لے گا۔ مگر لہروں کا بے ہنگم شور اور سمندر کا اتار چڑھاؤ کپتان شاہ کے حوصلے پست نہ کر سکا۔ کپتان کے چہرے پر خوف کے کوئی آثار نہیں تھے۔ طوفان کی پہلی دو راتوں نے اسے ایک عزم بخش دیا تھا اور حالات سے پنجہ آزما ہونے کا حوصلہ دے دیا تھا۔ اب وہ مکمل اعتماد کے ساتھ اپنے عملے کو ہدایات دے رہا تھا، حوصلے بڑھا رہا تھا۔ ادھر اب لہروں کے دیو ساٹھ فٹ سے بھی بلند ہونے لگے تھے اور ہوا کا دباؤ اتنا شدید ہو گیا تھا کہ کبھی کبھی لہروں کے تھپیڑے اتنے زوردار آتے کہ یہ گرانڈیل جہاز آبدوز بن جاتا۔ لہروں کے ریلے جہاز رانوں کے سروں پر سے گذر جاتے اور یوں ان لمحوں میں اوپر نیچے دائیں بائیں ہر طرف پانی ہی پانی کا شور کان میں پڑتا۔

کپتان شاہ کے لئے یہی آزمائش کا وقت تھا۔ اس کے سامنے صرف جہاز نہیں بلکہ پاکستان تھا، جس کا نام بلند کرنے کی خاطر اس نے یہ جوا کھیلا تھا۔ موت کے اس ننگے ناچ اور کان کے پردے پھاڑ دینے والے شور نے جہاز کے ایک افسر کا دماغی توازن بگاڑ دیا۔ وہ عرشے پر آ کر ہذیان بکنے لگا۔ اسے جہاز رانوں نے سنبھالنے کی کوشش کی، لیکن وہ پاگل ہو چکا تھا۔ دیوانہ وار بکتا رہا۔ کپتان شاہ برج سے بھاگا آیا۔ ایک بڑا سا ڈنڈا اُٹھایا اور اس آفیسر کے سر پر تین ڈنڈے لگا دیے۔ وہ خاموش ہو گیا۔ پھر بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ کپتان کے حکم کے مطابق اسے اٹھا کر اس کے کیبن میں ڈال دیا گیا۔ اگر کپتان اس وقت اپنے ہوش و حواس قائم رکھتے ہوئے اس افسر کے ساتھ یہ سلوک نہ کرتا تو خبر نہیں یہ دیوانہ اور کتنے لوگوں کو پاگل کر دیتا۔ چند لمحے کے لئے عرشے پر سکون

ہوگیا مگر پانی کے دباؤ میں کوئی کمی نہیں آتی تھی۔ ہوا مکمل طور پر مخالف رخ میں تھی۔ جہاز کی چادر پانی کے دباؤ سے مڑی جارہی تھی۔ جب بھی لہریں زور ڈالتیں اور جہاز کے تختے آپس میں ٹکراتے تو یوں لگتا کہ اب جہاز چکنا چور ہو جائے گا۔

کپتان تو تین روز سے برج سے نہیں اُترا۔ اس کے ذہن میں ایک اور مسئلہ ڈنک مار رہا تھا۔ وہ یہ کہ اس کی بیوی بھی اس کے ساتھ تھی جو امید سے تھی۔ وہ نیچے کیبن میں لڑھکنیاں کھا رہی تھی اور ہر لمحہ جان کے خطرے سے دوچار تھی۔ وہ تو ہلکا سا جھٹکا بھی برداشت کرنے کے قابل نہیں تھی۔ وطن سے، اپنے بھائی بہنوں سے ہزاروں میل دُور، وہ سمندر کی لہروں کے رحم و کرم پر تھی۔ پھر بھی یہ جری خاتون اپنے خاوند جہاز اور دوسروں کی جان کے لئے دعائیں مانگ رہی تھی۔ وہ اپنے خاوند کی ذمہ داری کو خوب سمجھتی تھی اور اس کے مُنہ سے بے ساختہ دعا نکل رہی تھی ـــــ "یارب العزت! انہیں ذمہ داری پوری کرنے کی ہمت عطا فرما۔"

جہاز میں کھانے پینے کا سامان بھی سمندر کے نمکین پانی کی زد میں آگیا تھا۔ "پینٹری" میں پانی داخل ہوگیا تھا۔ عملے کا حال بہت ہی بُرا تھا۔ سمندری لہریں ان کے مُنہ پر طمانچے مار کر لوٹ جاتیں۔ زبان سے نمک چمٹ جاتا۔ بدن پر چیونٹیاں سی رینگنے لگتیں۔ ان کے جسم شل ہو چکے تھے اور جہاز تھا کہ مسلسل ایک شرابی کی طرح ڈولے جا رہا تھا۔ طوفان کی زد میں آتے ہوئے جہاز کو چوتھا دن تھا۔

دن کے دس بج رہے تھے کہ کپتان نے وہیل پر بیٹھے جہاز ران کو حکم دیا کہ جہاز کو ہوا کے موافق رُخ پر ڈال دو۔ اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ طوفان کے مقابلے میں انسان حوصلہ ہار چکا تھا۔ نہیں، بلکہ اس لئے کہ تین روز سے طوفانی تھپیڑے سہتے ملاحوں اور افسروں کو کچھ آرام کا موقع مل سکے۔ ابھی کپتان کے حکم پر عمل کیا ہی جانے والا تھا کہ ایک زوردار لہر آئی اور پینٹری کے دروازے کو توڑتی ہوئی اندر جا گھسی۔ یہ طوفانی لہر واپس جانے لگی تو دو ملاحوں کو بھی ساتھ بہا لے گئی۔ ان کی خوش قسمتی کہ وہ دونوں ۲۰ فٹ دُور جہاز کے عرشے پر ہی گرے

یعنی جنگلے کے نزدیک فورکیسل سے جا لگے، کپتان نے ایک افسر کو انہیں بچانے کا حکم دیا۔ لیکن طوفان کا اس قدر زور تھا اور ہوا اس قدر شدید تھی کہ وہ بے چارہ حکم عدولی کر سکا نہ تعمیل، اس کا منہ کھُلے کا کھُلا رہ گیا۔ اک عجب کیفیت تھی۔ دو زندگیاں طوفان کے رحم و کرم پر تھیں۔ کسی کو جہاز کے اس کھلے حصّے میں، جہاں طوفانی ہواؤں کا زور تھا جانے کی جراٴت نہیں ہو رہی تھی۔ آخر دو مردانِ مجاہد دیوانہ وار بڑھے، جو ملاح ہی تھے اور بڑی مردانگی سے اپنے ساتھیوں کو اٹھا کر اندر لے آئے۔ وہ قدم قدم پر گرے، پیٹ کے بل رینگے، اپنے ساتھیوں کو اُٹھایا اور انہیں موت کے مُنہ سے بچا لائے۔

اب جسم چکنا چور، اور دماغ ماؤف اور اعصاب ریزہ ریزہ —— جہاز میں خوف و ہراس کی لہر دوڑنے لگی۔ لیکن کپتان شاہ کے پُرسکون چہرے، مسکراہٹ اور حوصلہ افزائی نے انہیں مایوس نہ ہونے دیا۔ جہاز چونکہ ہوا کے موافق رُخ پر پلٹ پڑا تھا۔ اس لئے اب قدرے سکون تھا۔ جہاز کے ڈولنے کی کیفیت بھی کم ہو گئی تھی۔ اس وقت پُرسکون سمندر اور ہوا کی موافقت کی قدر معلوم ہوتی۔ اب ہوا کے رُخ پر چلتے ہوتے جہاز کی درہم برہم چیزوں کو درست کیا گیا۔ بے تحاشہ ٹوٹ پھوٹ ہوتی تھی۔ ہر حصّے پر پانی نے یلغار کی تھی۔ پمپ تیزی سے چل رہے تھے۔ جہاز راں پانی نکالتے نکالتے بے حال ہو گئے تھے۔ طوفان کے اثرات سے نبٹنے میں آٹھ گھنٹے تو لگ گئے۔ یہ کتنی بے چارگی تھی کہ قافلہ اپنی منزل سے نزدیک ہونے کی بجائے دُور ہو رہا تھا۔ کپتان سوچ رہا تھا کہ اب تو دوسری کمپنی کا جہاز یقیناً پہلے پہنچ جاتے گا۔ یہ خیال مایوس کن اور شکست آمیز تھا۔

خدا نے اپنا فضل کیا اور اس جہاز کے لوگوں کی دعائیں مقبول ہوئیں۔ آہستہ آہستہ طوفان کی شدت میں کمی آنے لگی اور پسپائی کے پورے ایک روز بعد بیرومیٹر بڑھنا شروع ہُوا۔ بیرومیٹر کو دیکھ کر کپتان نے جہاز کا رُخ پھر منزل کی طرف کرنے کا حکم دیا۔ پھر وہی رستہ تھا اور سفینہ نصرت۔ اب تو یوں لگتا تھا جیسے جہاز رانوں کی طرح جہاز کا بھی جوڑ جوڑ دکھ رہا ہو۔ طویل عرصے کے بعد ملاّحوں کے چہرے پر بشاشت نظر آنے لگی تھی۔ طوفان کے جھکڑوں نے سب کو نیم مردہ کر دیا تھا۔ ایسے

لمحے بھی آتے تھے کہ موت اور جہاز رانوں میں ایک دو ہاتھ کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ اب مسلسل کرب و ابتلا کے بعد انہیں پُرسکون سمندر ملا تھا۔ اس سارے سفر میں کوئی اور بندرگاہ بھی نہیں تھی۔ اوپر سے اس جہاز کو طوفان نے بھی آگھیرا۔ اس سات روز کے مسلسل اور طوفانی سفر کے بعد ابھی بارہ تیرہ روز کا طویل اور مسلسل سفر باقی تھا۔ بہرحال اب سمندر معمول پر تھا۔

منزلِ مقصود پر پہنچنے سے تین روز پہلے سمندر کا مزاج قابلِ رشک حد تک درست ہو گیا۔ ان تین دنوں میں سمندر بڑے دوستانہ موڈ میں رہا۔ یہ فاصلہ ذرا تیزی سے طے ہو گیا اور سفینۂ نصرت کے اس طوفان زدہ عملے کو اپنی منزلِ مقصود فلوریڈا کی بندرگاہ جیکسن دکھائی دینے لگی تو ان کی حالت بالکل کولمبس کی سی ہو گئی۔ کیونکہ انہوں نے نہ صرف نئی زندگی بلکہ نئی دنیا دریافت کی تھی۔

۲۲ روز متواتر سمندری لہروں کے رحم و کرم پر رہنے کے بعد جب خشکی قریب آتی دکھائی دی تو ملاحوں کے حوصلے بڑھنے لگے۔ ہونٹوں پر کھلی مسکراہٹیں اور پھیل گئیں۔ لیکن کپتان شاہ کے چہرے پر تذبذب تھا۔ اس کی نظریں اس بندرگاہ پر کسی چیز کی متلاشی تھیں۔ نگاہیں دُور دُور تک جانے کے باوجود مایوس لوٹ رہی تھیں اور جب جہاز لنگر انداز ہو چکا تو کپتان نے فوراً بندرگاہ کے متعلقہ حکام سے بلجیم کے اس جہاز کے بارے میں دریافت کیا اور جب پتہ چلا کہ وہ ابھی نہیں پہنچا تو کپتان کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ آگئی اور اس کا چہرہ چمک اُٹھا۔ اس نے نہ صرف مقابلہ جیت لیا تھا بلکہ پاکستان کا نام بلند کر دیا تھا۔ کمپنی کی ساکھ قائم ہو گئی تھی۔ اس کا مقابلہ صرف غیر ملکی جہاز سے نہیں بلکہ اس قدر شدید طوفان سے بھی تھا، لیکن کپتان کا اعتماد اس جہاز کو منزلِ مقصود تک لے آیا تھا۔ طوفانی لہریں صرف چند ایک کاروں کو نقصان پہنچا سکی تھیں۔ کوئی انسانی زندگی اس طوفان کی بھینٹ نہیں چڑھی تھی۔ حالانکہ اسی طوفان کی زد میں آنے والے تین دوسرے جہاز تباہ ہو گئے تھے۔

بلجیم کا جہاز جو پُرسکون راستے سے آیا۔ وہ بندرگاہ پر اگلے روز پہنچا "سفینۂ نصرت" کے کپتان کے لئے یہ زندگی کی سب سے بڑی کامیابی تھی اور

آج کراچی میں سمندر کے کنارے ایک خوبصورت بنگلے میں اپنے بیوی، بچوں کے ساتھ پرسکون زندگی گذارتے ہوئے جب کپتان این، ایچ شاہ اور ان کی بیگم کو وہ طوفانی چھ دن اور چھ راتیں یاد آتی ہیں تو دل دہل جاتا ہے۔ کہاں یہ پُرسکون دن اور کہاں وہ اوسان خطا کر دینے والی گھڑیاں!

وہ پاگل نہ تھا

بڑھاپے کی آخری منزل میں آکر میرے والد صاحب کے جسم کی ساری طاقت زبان میں آگئی ہے۔ اتنا زیادہ کبھی بھی نہیں بولے تھے۔ مختصر بات کرنے کے عادی تھے اور باتونی لوگوں سے کنی کترایا کرتے تھے۔ ہماری والدہ کو وہ اکثر ٹوکتے اور کہتے تھے کہ خدا کی بندی! زبان کو کبھی تو دانتوں کے نیچے دبا لیا کرو، مگر اب والد صاحب نے یہ صورتِ حال بنا رکھی ہے کہ آپ اُن سے اتنا کہہ دیں کہ آج گرمی کچھ زیادہ ہے تو وہ اپنی زندگی کے کسی نہ کسی موسمِ گرما کا ایک واقعہ سنا دیں گے۔ کوئی بات کرو انہیں ایک واقعہ یاد آجائے گا جو پوری تفصیل سے سُنادیں گے۔

مزے کی بات یہ ہے کہ وہ بور نہیں کرتے۔ کوئی بھی واقعہ سنانے لگیں گے تو آپ یہ محسوس نہیں کریں گے کہ بوڑھا مغز چاٹ رہا ہے۔ اُن کی عمر اسّی سے ایک دو مہینے کم ہے۔ میں اُن کا سب سے بڑا بیٹا ہوں اور میرے بیٹے کی شادی ہو چکی ہے۔ والد صاحب بہت سے واقعات اور حادثات سُنا چکے ہیں۔ ان میں کچھ ایسے ہیں جو لکھنے اور چھپوانے کے قابل ہیں۔ ایک واقعہ انہی کی زبانی پیش کرتا ہوں۔

میری عمر ابھی چالیس سال نہیں ہوئی تھی۔ دو چار مہینے باقی تھے اور پاکستان ابھی نہیں بنا تھا۔ اس سے سوا ڈیڑھ سال پہلے کا واقعہ ہے۔ ہمارا یہ گاؤں اب تو قصبہ بن گیا ہے۔ اُس وقت یہ چھوٹا سا گاؤں تھا۔

یہاں عبدالرحمٰن ایک سکول ٹیچر ہوا کرتا تھا۔ روزانہ ساڑھے تین میل

دُور شہر کے ایک مڈل سکول میں پڑھانے جایا کرتا تھا۔ اُس کا شغل یہ تھا کہ جہاں اُسے پتہ چلتا کہ سنیاسیوں کا ڈیرہ ہے، وہ وہاں چلا جاتا اور ہر روز جاتا اور کئی کئی گھنٹے سنیاسیوں کے پاس گزارتا تھا۔ اُس کا چھٹی کا پورا پورا دن سنیاسیوں کے پاس گزرتا تھا۔

پاکستان بنا تو سنیاسی بھی غائب ہو گئے۔ وہ ہندو ہوتے تھے۔ جوگیا رنگ کے کھدر کے کپڑے پہنتے تھے۔ اُن کی زندگی خانہ بدوشوں جیسی تھی۔ جنگلوں اور بیابانوں میں جڑی بُوٹیوں کی تلاش میں پھرتے رہتے تھے۔ وہ سانپ اور بچھو بھی رکھتے تھے۔ وہ جڑی بُوٹیوں کی دوائیاں بناتے تھے اور جہاں کہیں وہ ڈیرہ لگاتے، قریبی آبادیوں کے لوگ اپنے مریضوں کو لے کر اُن کے پاس جا پہنچتے تھے۔

اُن کے پاس نایاب نسخے بھی ہوتے تھے اور ایسی بُوٹیاں بھی اُن کے پاس ہوتی تھیں جو پنساریوں اور حکیموں کو کہیں سے بھی نہیں ملتی تھیں۔ یہ سنیاسی اس قسم کی بُوٹیوں کی دوائیاں بڑی مہنگی دیتے تھے۔ ان کے متعلق بڑی عجیب اور پُر اسرار کہانیاں لوگوں نے مشہور کر رکھی تھیں۔

ماسٹر عبدالرحمٰن سنیاسیوں کی بہت خدمت کرتا تھا۔ وہ میرا دوست تھا۔ میں اُسے کہا کرتا تھا کہ وہ اپنا وقت ضائع کر رہا ہے، ان سنیاسیوں سے اُسے کچھ نہیں ملے گا۔ عبدالرحمٰن کہتا تھا کہ ان کے پاس ایسی دوائیاں ہیں جو مُردے میں جان ڈال دیتی ہیں اور مٹی کو سونا بنا دیتی ہیں۔ میری اس بات کا ماسٹر عبدالرحمٰن کے پاس کوئی جواب نہیں تھا کہ سنیاسیوں کے پاس اگر مٹی کو سونا بنانے والی کوئی چیز ہے تو یہ کیوں نہیں سونا بنا لیتے اور عیش کرتے۔

میری یہ بات سُن کر ماسٹر عبدالرحمٰن ہنس پڑتا تھا۔ ایک دو بار اُس نے کہا تھا کہ سنیاسی تارک الدنیا ہوتے ہیں اور دل میں دنیا کا لالچ نہیں رکھتے۔

سکولوں میں ڈیڑھ مہینہ گرمیوں کی چھٹیاں ہوتی تھیں۔ دس چھٹیاں دسمبر کے آخر میں ہوتی تھیں۔ دس چھٹیاں موسمِ بہار کی بھی ہوتی تھیں۔ عبدالرحمٰن

یہ تمام چھٹیاں سنیاسیوں کے پاس گزارا کرتا تھا۔ مجھے یہ کبھی بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ اُسے سنیاسیوں نے شاگردی میں بٹھایا تھا یا نہیں، اور اگر اُسے اپنا شاگرد بنا لیا تھا تو کس معاوضے کے عوض بنایا تھا۔ مجھے اتنا ہی علم تھا کہ وہ اُن کی بہت خدمت کرتا تھا۔ کبھی گاؤں سے خالص گھی اکٹھا کر کے لے جاتا، کبھی مُرغیاں اور انڈے لے جاتا اور ایک بار وہ ایک دُنبہ لے گیا تھا۔

میرا اُس کے گھر میں آنا جانا تھا۔ ہماری دوستی بہت گہری تھی۔ ہمارا دُکھ سُکھ سانجھا تھا۔ ایک روز میں اُس کے گھر گیا تو اُس کے صحن میں اُپلوں کا ڈھیر لگا ہُوا تھا اور یہ جل رہا تھا۔ ماسٹر عبدالرحمٰن آگ سے دُور چارپائی پر بیٹھا ہُوا تھا۔ میں نے پوچھا یہ کیا ہے؟

"دواتی بن رہی ہے" ___ اُس نے جواب دیا ___ "اُپلوں کے نیچے ایک بُوٹی ہے۔ اُپلوں کے ساتھ یہ بُوٹی بھی راکھ ہو جائے گی، پھر اس راکھ سے ایک دواتی بنے گی .... دواتی کیا ہو گی جی! آبِ حیات بنے گا۔ جو یہ دواتی ایک ہفتہ مکمل پرہیز کے ساتھ کھاتے گا اُسے کوڑھ اور چیچک نہیں ہو گا۔"

پھر دواتیاں بنانا ماسٹر عبدالرحمٰن کا شغل نہیں بلکہ خبط اور جنون بن گیا۔ سائنسدانوں کی طرح تجربے کرتا رہتا تھا۔ اُس کی بیوی نے مجھے بہت دفعہ کہا کہ ماسٹر عبدالرحمٰن کو میں ادھر سے ہٹاؤں لیکن وہ میری نہیں مانتا تھا۔

اُس نے تین سال گزار دیئے۔ دیہاتی علاقے میں ڈاکٹر نہیں ہوتے تھے۔ لوگ بزرگوں کے بتاتے ہوتے ٹوٹکے استعمال کرتے تھے یا شہر کسی ڈاکٹر یا حکیم کے پاس چلے جاتے تھے۔ عبدالرحمٰن کے پاس اپنے گاؤں کا پہلا کیس آیا۔ یہ دو سال عمر کا ایک بچہ تھا جو روتا اور چیختا تھا اور بار بار سینے پر ہاتھ رکھتا تھا۔ ایسے لگتا تھے جیسے اُسے کوئی دَورہ پڑ گیا ہو۔

ماسٹر عبدالرحمٰن نے اُس کی نبض دیکھی، چہرہ دیکھا اور کہا کہ یہ نمونیہ ہے۔ اُس نے اپنی بنائی ہوئی ایک دواتی دی۔ تین چار گھنٹوں بعد بچے کو ایسا

پسینہ آیا جیسے اسے پانی میں سے نکالا گیا ہو۔ اس کے بعد بچّے کا رونا اور تڑپنا ختم ہو گیا اور دو تین دنوں میں بچہ ٹھیک ہو گیا۔ بچّے کے باپ نے ماسٹر عبدالرحمٰن کو بہت پیسے دیتے تھے۔

وہ میرا ہم عمر تھا اور میرا دوست بھی۔ اُس نے مجھے بتایا تھا کہ اُس نے یہ نسخہ سنیاسیوں سے حاصل کیا ہے۔ کھانسی، نزلہ اور زکام کا علاج تو اُس نے کرنا شروع کر ہی دیا تھا، وہ ملیریا اور ٹائیفائیڈ کا بھی علاج کرنے کے قابل ہو گیا تھا۔

ہمارے گاؤں کی ایک لڑکی کی شادی ہوئی۔ اُس کے سسرال دو اڑھائی میل دُور ایک گاؤں میں تھے۔ تین مہینے بعد لڑکی کو جسمانی اینٹھن کے دورے پڑنے لگے۔ دیہات کے رواج کے مطابق ان دَوروں کو آسیبی اثر سمجھ کر تعویذوں کے ذریعے علاج ہونے لگا مگر ذرہ برابر افاقہ نہ ہُوا۔

لڑکی اپنے گاؤں آئی ہوئی تھی۔ ایک روز ماسٹر عبدالرحمٰن اُس کے گھر چلا۔ اُسے یہ اطلاع ملی تھی کہ لڑکی کو دَورہ پڑا ہے۔ اُس نے اس لڑکی کو دورے کی حالت میں دیکھا۔ اُس کی نبض دیکھی، جسم کے پٹھوں کو ہاتھ لگا کر دیکھا اور اُس کے گھر والوں سے پوچھا کہ دَورہ کس طرح پڑا تھا۔

ماسٹر عبدالرحمٰن نے لڑکی کی ناک کے آگے کوئی چیز رکھی۔ پانچ سات منٹ کے بعد لڑکی کی اینٹھن ختم ہو گئی اور وہ ٹھیک حالت میں آگئی۔ ماسٹر عبدالرحمٰن نے لڑکی سے کچھ بھی نہ پوچھا۔ اُس نے لڑکی کے باپ سے کہا کہ اس لڑکی کے خاوند کو بلا کر اُس کے پاس بھیج دے۔

خاوند اُس کے پاس آگیا۔ ماسٹر عبدالرحمٰن نے اُسے کچھ بتایا اور اُس کی بیوی کو کوئی دوائی نہیں دی۔ اُس نے کسی اور کو نہیں بتایا کہ خاوند کو اُس نے اُس کی بیوی کا کیا مرض بتایا تھا۔ میں نے ماسٹر عبدالرحمٰن سے پوچھا تو اُس نے مجھے کچھ نہ بتایا۔ لڑکی کے دورے ایک مہینے بعد کم ہونے شروع ہوئے اور ایک ہفتے میں ختم ہو گئے۔ چار پانچ سال بعد ماسٹر عبدالرحمٰن نے مجھے بتایا کہ اُس نے لڑکی کو دوائی دینے کی بجائے ایک مہینہ اُس کے خاوند

کو دوائی کھلاتی تھی۔

تھوڑے سے عرصے میں ماسٹر عبدالرحمٰن ٹھیک ٹھاک حکیم بن گیا۔ اُس وقت بیماریاں اتنی زیادہ نہیں تھیں جتنی آج کل ہیں۔ موسم بدلتا تھا، خاص طور پر جب گرم سے سرد ہوتا تھا تو کھانسی، نزلہ اور زکام کی شکایت عام ہوجاتی تھی یا کسی کو ملیریا ہوجاتا تھا جسے باری کا بخار کہتے تھے۔

علاج کے دوران ماسٹر عبدالرحمٰن کو جہاں پتہ چلتا کہ سنیاسی آتے ہوتے ہیں وہ وہاں جا پہنچتا۔ اُس نے ٹیچری چھوڑ دی اور حکمت کے پیچھے پڑ گیا۔ وہ صرف پیسہ کمانے کی فکر نہیں کرتا تھا بلکہ زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرنے میں لگا رہتا تھا۔ کسی جڑی بوٹی کی تلاش میں نکلتا تو ہفتہ ہفتہ گھر سے باہر رہتا اور عجیب عجیب تین چار بوٹیاں لے کر آتا۔

وہ بچھو بھی پکڑ کر لایا۔ اُس نے چمگادڑ بھی پکڑے اور ان سے دوائیاں بنائیں۔ اُس کے پاس ساتھ والے گاؤں سے بھی مریض آتے تھے۔ کبھی کبھی کوئی ایسا مریض آجاتا جس کے مرض کو وہ نہیں سمجھتا تھا۔ وہ سوچے سمجھے بغیر دوائی نہیں دیتا تھا۔ صاف کہہ دیتا تھا کہ اسے شہر ہسپتال میں لے جاؤ۔ ہسپتال میں سرکاری ڈاکٹر ہوتا تھا لیکن وہ آج کل کے ڈاکٹروں کی طرح انسانوں کو مویشی نہیں سمجھتا تھا۔ اُن وقتوں کے ڈاکٹروں میں انسانی ہمدردی ہوتی تھی۔

پانچ ساڑھے پانچ سال گزر گئے۔ ماسٹر عبدالرحمٰن کا گھر دواخانہ بن چکا تھا۔ ہمارے گاؤں سے ایک میل دُور ایک بڑا گاؤں تھا۔ وہاں سے بھی ایک دو مریض روزانہ ماسٹر عبدالرحمٰن کے پاس آیا کرتے تھے۔ اُس گاؤں کی ایک بڑی خوبصورت عورت بھی کبھی کبھی اُس کے پاس آتی تھی۔ اُس کی عمر ستائیس اٹھائیس سال ہوگی۔ وہ ایک اونچے خاندان کی شادی شدہ عورت تھی۔ اپنی ایک نوکرانی کے ساتھ گھوڑی پر آیا کرتی تھی۔ ہمارے گاؤں کے لوگوں نے اس عورت کے متعلق کچھ کہانیاں مشہور کی ہوتی تھیں۔ کہتے تھے کہ عورت جتنی چالاک اور ہوشیار ہے اس کا خاوند اتنا ہی سیدھا اور سادہ سا آدمی ہے۔

ماسٹر عبدالرحمٰن اُس کی تعریفیں کرتا تھا۔ عید پر وہ ماسٹر عبدالرحمٰن کو کپڑوں

کا نیا جوڑا اور پگڑی دے گئی اور اُس نے ماسٹر عبدالرحمٰن کے بچوں کو پیسے بھی دیتے تھے۔ دو تین دفعہ اس عورت کی صرف لوٹ کر آنی آتی تھی۔

ایک روز صبح ہی صبح ہمارے گاؤں میں خبر پہنچی کہ اس عورت کا خاوند مر گیا ہے۔ شہر کی طرف جانے والا راستہ ہمارے گاؤں کے ساتھ سے گزرتا تھا۔ ہم نے دیکھا کہ اُس گاؤں کے چار آدمی بہت تیز تیز شہر کی طرف دوڑے جا رہے تھے۔ دو آدمی گھوڑیوں پر اور دو سائیکلوں پر سوار تھے۔ میں بھی اُس وقت باہر کھڑا تھا۔ دیہات کے لوگ اس طرح قریب سے گزر نہیں جایا کرتے تھے کہ سلام دعا بھی نہ کریں۔ اُن سے ہمارے ایک آدمی نے پوچھا کہ خیریت تو ہے ذرا رک جاؤ، پانی پی کر جاؤ۔

اُن میں سے ایک نے بغیر رُکے کہا کہ فلاں آدمی مر گیا ہے۔ یہ فلاں آدمی اس عورت کا خاوند تھا۔ ہم حیران تھے کہ ایک آدمی مر گیا ہے تو یہ چاروں جو اُس کے قریبی رشتہ دار تھے شہر کی طرف کیوں دوڑے جا رہے ہیں؟

دو اڑھائی گھنٹے گزرے ہوں گے کہ پولیس ہمارے گاؤں کے قریب سے گزری۔ علاقے کا تھانیدار تھا اور اُس کے ساتھ ہیڈ کانسٹیبل اور کانسٹیبل تھے اور پولیس کے ساتھ وہی چار آدمی تھے جو گھوڑیوں اور سائیکلوں پر شہر کو جا رہے تھے۔ ہم سمجھ گئے کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ ہم نے دو تین آدمی اُدھر بھیج دیئے۔

اُن کے واپس آنے سے پہلے ہی چار آدمیوں نے کندھوں پر اُٹھائی ہوئی چارپائی ذرا دم لینے کے لئے ہمارے گاؤں کے ساتھ اتاری۔ ان کے ساتھ ہیڈ کانسٹیبل تھا۔ چارپائی پر اُس عورت کے خاوند کی لاش تھی۔ اسے پوسٹمارٹم کے لئے شہر لے جایا جا رہا تھا۔ اس پر چادر پڑی ہوئی تھی۔ ہمیں بتایا گیا کہ اس کے رشتہ داروں نے شک ظاہر کیا ہے کہ یہ کسی بیماری سے نہیں مرا، اسے زہر دیا گیا ہے۔ اس کی بیوی کی کوشش تھی کہ اسے جلدی دفن کر دیا جائے مگر مرنے والے کے رشتہ داروں نے لاش کا چہرہ دیکھا تو تھانے چلے گئے اور پولیس کو ساتھ لے آئے۔

تھانیدار اُسی گاؤں میں رہ گیا تھا۔ اُس نے اُدھر ہی تفتیش کرنی تھی۔ ہمیں ابھی یہ معلوم نہیں ہوا تھا کہ زہر دینے کا شک کس پر کیا گیا ہے۔ ماسٹر عبدالرحمٰن نے لاش کے چہرے سے چادر ہٹاتی۔

"اوہ!"— اُس نے کہا —"یہ تو صاف زہر خورانی کا معاملہ ہے"۔

میں نے بھی لاش کا چہرہ دیکھا تھا۔ ناک اور مُنہ سے جھاگ پھوٹی ہوتی تھی اور چہرے کا رنگ نیلا ہو گیا تھا۔

لاش پوسٹمارٹم کے لئے چلی گئی اور شام سے پہلے واپس آگئی اور ہمارے گاؤں کے قریب سے گزر گئی۔ بڑی سنسنی خیز واردات تھی۔ دیہات میں ایک میل کوئی فاصلہ نہیں ہوتا۔ کئی آدمی تماشہ دیکھنے وہاں چلے گئے۔ رات کو واپس آتے تو گاؤں کے لوگ اُن کے ارد گرد جمع ہو گئے۔ وہ سُنی سُنائی باتیں سنانے لگے اور وہ اپنی اپنی راتے بھی دیتے تھے۔

"پولیس نے مقتول کی بیوی اور اُس کی نوکرانی کو بٹھایا ہُوا ہے"— انہوں نے بتایا —"دو اور آدمیوں کو بھی شک میں پکڑا ہُوا ہے"۔

اگلا دن اور اگلی رات بھی اُس گاؤں سے خبریں آتی رہیں۔ اس سے اگلے دن صبح دس بجے کے لگ بھگ تھانیدار ہمارے گاؤں کے قریب سے گزرا۔ اُس کے اپنے آدمی اُس کے ساتھ تھے۔ ان کے علاوہ وہ عورت بھی پولیس کے ساتھ تھی جو ماسٹر عبدالرحمٰن کے پاس آیا کرتی تھی۔ وہ اب بیوہ ہو گئی تھی۔ اُس کی نوکرانی بھی ساتھ تھی اور گاؤں کے کچھ اور آدمی بھی ساتھ تھے۔ اس عورت کی شادی کو سات آٹھ سال ہو گئے تھے، بچہ نہیں ہُوا تھا۔

ایک ہی دن اور گزرا تھا کہ ایک کانسٹیبل ہمارے گاؤں میں آیا اور ماسٹر عبدالرحمٰن کو ساتھ لے گیا۔ شام ہونے والی تھی کہ چھوٹا تھانیدار دو کانسٹیبلوں کو ساتھ لے کر آیا۔ ماسٹر عبدالرحمٰن اُن کے ساتھ تھا اور اُسے ہتھکڑی لگی ہوتی تھی۔ اُس کی بیوی اور بچوں نے رونا شروع کر دیا۔ ماسٹر عبدالرحمٰن خاموش تھا۔

ماسٹر کے گھر کی تلاشی ہوئی۔ معلوم نہیں تھانیدار کو کچھ ملا یا نہیں۔ وہ ماسٹر کو ساتھ لے کر چلا گیا اور وہ گاؤں کے دو آدمیوں کو بھی ساتھ لے گیا۔ انہیں اُس نے تلاشی اور برآمدگی کے گواہ بنایا تھا۔ یہ دونوں آدمی رات کو واپس آئے۔ انہوں نے بتایا کہ ماسٹر کی اپنی نشاندہی پر ایک شیشی چھوٹے تھانیدار نے برآمد کی ہے اور بیان دیا ہے کہ اس شیشی میں سے اُس نے اِس خوبصورت عورت کی نوکرانی کو ذرا سا زہر دیا تھا۔ نوکرانی نے ماسٹر عبدالرحمٰن کو کہا تھا کہ اُسے عورت نے بھیجا ہے کہ ذرا سا زہر دے دو، جنگلی چوہوں نے دو کھیت خراب کر دیئے ہیں۔

ماسٹر عبدالرحمٰن نے اِن آدمیوں کی موجودگی میں برآمدگی کے وقت اپنے بیان میں یہ بھی کہا تھا کہ اُس نے نوکرانی کو کہا تھا کہ آدھی بالٹی پانی میں یہ زہر ملا کر اس میں گندم ڈال دینا۔ کچھ دیر بعد یہ گندم چوہوں کے بلوں میں پھینک دینا۔

ہم سب کو سمجھ آگئی کہ اس عورت نے اپنے خاوند کو زہر دیا ہے اور یہ زہر چوہوں کو مارنے کے بہانے ماسٹر عبدالرحمٰن سے حاصل کیا گیا تھا۔ میں نے بتایا ہے کہ یہ عورت بہت خوبصورت تھی۔ وہ ماسٹر عبدالرحمٰن کے پاس آتی رہتی تھی۔ ماسٹر ایسا آدمی نہیں تھا کہ وہ کسی جوان اور خوبصورت عورت سے متاثر یا مرعوب ہو جاتا۔ وہ روپے پیسے کے لالچ میں آنے والا بھی نہیں تھا۔ وہ سادگی میں یہ غلطی کر بیٹھا تھا لیکن قانون کی نگاہ کچھ اور ہوتی ہے۔ قانون نے تو یہ دیکھنا تھا کہ ایک آدمی زہر سے ہلاک ہو گیا ہے اور زہر دینے والی نے زہر فلاں آدمی سے حاصل کیا تھا۔

ماسٹر عبدالرحمٰن کا تو یہ بھی جرم ہی تھا کہ اُس نے گھر میں زہر رکھا ہوا تھا۔ وہ سند یافتہ حکیم نہیں تھا۔ پولیس اُسے اپنے ساتھ لے گئی۔

گاؤں میں خبریں آتی رہتی تھیں کہ تھانے میں کیا ہو رہا ہے اور کس نے کیا بیان دیا ہے۔ بیان دراصل اس عورت کی نوکرانی نے دیا تھا کہ وہ ماسٹر عبدالرحمٰن سے اپنی مالکن کے کہنے پر زہر لاتی تھی۔ اُسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اُس کی مالکن

نے یہ زہر چوہوں کو دیا تھا یا اپنے خاوند کو دے دیا تھا۔ اس عورت نے تسلیم نہیں کیا تھا کہ اُس نے خاوند کو زہر دے دیا ہے۔

تھانے سے آتی ہوئی خبریں غلط بھی ہو سکتی تھیں بعض لوگ یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ وہ اثر ورسوخ والے ہیں اور انہیں اندر کی باتیں معلوم ہوتی ہیں، طرح طرح کی باتیں سُناتے تھے۔ کبھی سُننے میں آتا کہ زہر دینے والی نے اپنے جرم کا اقبال کر کے پورا بیان دے دیا ہے اور کبھی یہ سُننے میں آتا کہ اس خوبصورت عورت نے تھانیدار پر اپنا جادو چلا لیا ہے۔

اس واردات میں دو اور آدمی بھی گرفتار کئے گئے تھے۔ ہم سب کو اس میں تو دلچسپی ضرور تھی کہ تھانے میں کیا ہو رہا ہے اور کون کیا بیان دے رہا ہے لیکن زیادہ دلچسپی اس میں تھی کہ اس عورت نے خاوند کو زہر دیا کیوں۔ یہ بات معلوم کرنا مشکل نہیں تھا۔ یہ قصہ مقتول کے گاؤں سے معلوم ہو گیا۔

یہ وہی پرانا قصہ تھا۔ لڑکی کسی اور کو چاہتی تھی مگر اُس کی شادی کسی اور کے ساتھ ہو گئی لیکن یہاں یہ معاملہ تھا کہ لڑکی کسی کو بھی نہیں چاہتی تھی۔ اُس نے اسی خاوند کو قبول کر لیا تھا لیکن یہ خاوند بالکل ہی سیدھا اور بدھو سا نکلا۔ وہ بیوی کو اپنے رُعب میں رکھنے کی بجائے بیوی کے رُعب میں رہنا پسند کرتا تھا۔ اُس کی زمین بہت تھی اور وہ اُونچی ذات کا مالدار آدمی تھا۔

دیہات میں اونچی ذاتوں والے مالدار لوگ سیدھے اور بدھو نہیں ہُوا کرتے تھے۔ وہ تو حکم چلاتے تھے لیکن یہاں معاملہ اُلٹ تھا۔ لڑکی شوخ تھی اور زندہ دل بھی تھی۔ اُس کا خاوند بدصورت آدمی نہیں تھا لیکن اُس میں دیہاتی مردوں والا رُعب اور دقار نہیں تھا۔

لڑکی نے تین ساڑھے تین سال اُس کے ساتھ گزار لیا۔ آخر وہ تنگ آگئی۔ اُس کی سہیلیاں اُس کے ساتھ مذاق کرنے لگی تھیں۔ وہ اپنے خاوند سے کھچی کھچی رہنے لگی۔ چار سال گزر گئے تو بھی کوئی بچہ نہ ہُوا۔ اسی گاؤں کا ایک آدمی جس کی عمر اس لڑکی سے چار یا پانچ سال زیادہ تھی لڑکی کو اچھا لگنے لگا۔ یہ ان کی اپنی برادری رشتہ داری کا آدمی تھا۔

خاوند کو دو تین سال پتہ ہی نہ چلا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ آخر اُسے پتہ چلا تو اُس نے اُس آدمی کو اپنے گھر میں آنے سے روک دیا۔ وہ یکلخت مرد بن گیا۔ اس کی بیوی اسے اپنا نوکر ہی سمجھتی رہی اور اُس آدمی سے کہیں باہر ملی۔ اُس کے خاوند کو اس کا پتہ چل گیا۔ وہ اُس کے پیچھے گیا اور گھر لا کر اُسے بہت مارا پیٹا۔

"تم میرے دل کو اچھی لگتی تھیں، اس لئے میں تمہارے آگے جھکا رہتا تھا"— اُس نے بار بار بیوی سے کہا اور یہ الفاظ لوگوں نے بھی سُنے۔

اس کے بعد اس عورت اور اُس آدمی کو کسی نے ملتے ملاتے نہیں دیکھا اور چار پانچ مہینے گزر گئے۔ ماسٹر عبدالرحمٰن کی شہرت اُس گاؤں میں بھی تھی۔ عورت کو کوئی تکلیف ہو گئی۔ اُس نے خاوند کو بتایا کہ وہ ماسٹر عبدالرحمٰن کے پاس جانا چاہتی ہے۔ خاوند نے نوکرانی کو اُس کے ساتھ بھیج دیا۔ پھر وہ نوکرانی کے ساتھ ہی آتی جاتی رہی، پھر نوکرانی اکیلی آتی رہی اور اس عورت نے اپنے خاوند کو ایک رات دُودھ میں زہر پلا دیا۔

وہ جسے ملتی ملاتی تھی وہ بھی گرفتار ہو گیا تھا۔ اُس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی پکڑا گیا تھا لیکن اُسے پولیس نے چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ تین ملزم رہ گئے۔ یہ عورت، ماسٹر عبدالرحمٰن اور اس عورت کا دوست۔ مقدمہ نو دس مہینے چلا لیکن استغاثہ اتنا کمزور تھا کہ سیشن کورٹ نے شک کی بنا پر تینوں کو بری کر دیا۔ اس عورت اور آدمی نے ماسٹر عبدالرحمٰن کا بہت خیال رکھا تھا۔ ماسٹر کو الگ وکیل نہیں کرنا پڑا تھا۔ سب کا ایک ہی وکیل تھا۔ ماسٹر عبدالرحمٰن سے وکیل نے کہلوایا تھا کہ اُس نے زہر دیا ہی نہیں تھا۔

عدالت سے اکثر قاتل بری ہو جایا کرتے ہیں۔ یہ بھی بری ہو گئے لیکن ماسٹر عبدالرحمٰن کو ایسا صدمہ ہُوا کہ وہ بری ہو کر جیل سے نکلا تو اُس پر خاموشی طاری تھی۔ گاؤں کے لوگ اُسے مبارک دیتے تھے تو وہ کہتا تھا — "نہیں، میرے زہر سے ایک آدمی مر گیا ہے۔"

اُس نے تمام دوائیاں جو بڑی محنت سے تیار کی تھیں اور تمام جڑی

بُوٹیاں جو اُس نے نہ جانے کہاں کہاں مارے مارے پھر کر اکٹھی کی تھیں، باہر ایک گڑھا کھود کر اس میں پھینک دیں اور گڑھا مٹی سے بھر دیا۔ ہر کسی نے اُسے سمجھایا کہ اُس نے اس آدمی کو مارنے کے لئے زہر نہیں دیا تھا، اس نے تو جو ہے مارنے کے لئے دیا تھا لیکن ماسٹر کچھ بھی نہیں سنتا تھا۔

میں اُس کا دوست تھا۔ وہ میری باتیں سُنتا تھا لیکن اثر نہیں لیتا تھا۔ گاؤں میں دو بچے نمونیے سے مر گئے۔ لوگوں نے اُسے کہا کہ وہ دوائی بنا کر دے لیکن وہ تو جیسے سُن ہی نہیں رہا تھا۔ میرے پاس بیٹھ کر وہ روتا تھا۔ میں اُس کے ساتھ بہت مغز کھپاتا تھا لیکن وہ یہی ایک جواب دیتا تھا کہ میرے زہر سے ایک آدمی مر گیا ہے۔

اُس نے چار پانچ مہینے نمازیں پڑھیں۔ اُس کے گھر میں کھانے کو کچھ نہ تھا۔ لوگ اُس کی بیوی کو دانے اور دالیں دیتے رہے۔ ماسٹر نے نمازیں بھی چھوڑ دیں اور پاگلوں کی طرح اِدھر اُدھر پھرنے لگا۔ لوگوں نے اُسے پاگل قرار دے دیا۔ وہ چپ چاپ رہتا تھا۔ اُس کی بیوی نے بتایا کہ رات کو بھی وہ باہر نکل جاتا ہے اور خود ہی واپس آ جاتا ہے۔

وہ گاؤں سے دُور بھی نکل جاتا تھا۔ دراصل وہ پاگل نہیں ہُوا تھا میرے ساتھ وہ ایک آدھ بات کر لیتا تھا لیکن میری نہیں سُنتا تھا۔ ایک روز سورج غروب ہونے کے وقت وہ اُس گاؤں کی طرف سے آ رہا تھا جہاں اُس عورت نے اپنے خاوند کو زہر دیا تھا۔ میں راستے میں کھڑا تھا۔ وہ میرے پاس رُک گیا۔

"بات نہیں بنی" — اُس نے کہا اور کرتے کی جیب سے ایک شیشی نکال کر مجھے دکھائی اور نہایت آہستہ آہستہ مریضوں کی سی آواز میں کہنے لگا — "اس شیشی میں زہر ہے۔ یہ میں نے تیار کیا ہے۔ میں روز اُدھر جاتا رہا۔ وہ ملی نہیں۔"

"کون نہیں ملی؟" — میں نے پوچھا۔

"وہی" — اُس نے کہا — "جس نے اپنے خاوند کو زہر دیا تھا اور

مجھے دوزخ میں ڈال دیا ہے۔"

آپ اندازہ کریں اُس کا دماغ کتنا صحیح تھا۔

"آج مل گئی" — اُس نے کہا — "وہ کھیتوں میں اپنی عمر کی دو عورتوں کے ساتھ گھوم پھر رہی تھی۔ میں اُس کے قریب سے گزرا تو وہ میرے قریب آ گئی۔ میں یہی چاہتا تھا۔ اُس نے پوچھا کہاں سے آ رہے ہو؟ میں نے جھوٹ بولا کہ پیر صاحب کے پاس پانی دم کرانے گیا تھا۔ میں نے جیب سے یہ شیشی نکال کر اُسے دکھائی اور کہا کہ یہ دم کیا ہُوا پانی ہے۔ میں نے شیشی کھول کر اُسے دی اور کہا کہ تھوڑا سا تم پی لو۔ اللہ مشکلیں آسان کر دے گا ....

"میں اُس کو زہر پلا کر مارنا چاہتا تھا۔ سوچا تھا کہ مجھے دوزخ سے اسی طرح نجات ملے گی۔ قاتل کو سزائے موت ملنی چاہیئے میں نے اُس کو شیشی دے دی اور وہ شیشی اپنے مُنہ سے لگانے لگی۔ مجھے اس طرح دھکّہ لگا جیسے آسمان بڑی زور سے پھٹ گیا ہو۔ میں نے جھپٹ کر شیشی اُس کے ہاتھ سے چھین لی۔ وہ ڈر گئی اور مجھ سے پوچھا کہ میں نے شیشی اُس سے کیوں لے لی ہے۔ میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ میں نے ویسے ہی کچھ کہہ دیا اور وہاں سے آ گیا۔ تینوں عورتیں ہنس پڑیں اور اُس عورت نے کہا، پاگل ہو گیا ہے ....

"میں ضرور پاگل ہو جاؤں گا۔ میں نے سوچا کہ اس عورت کو مار کر مجھے چین اور سکون آ جائے گا لیکن میں نے اُس کے مُنہ کے ساتھ لگا ہُوا زہر اُس سے چھین لیا .... اب کیا کروں؟" — وہ مجھے وہیں کھڑا چھوڑ کر اپنے گھر کو چل پڑا۔ وہ آہستہ آہستہ کہتا جا رہا تھا — "اب کیا کروں؟ اب کیا کروں؟"

صبح ہم مسجد میں نماز پڑھ کر فارغ ہوتے ہی تھے کہ ایک عورت کی چیخیں سُنائی دیں اور بچے زور زور سے رونے لگے۔ ہم سب دوڑے۔ چیخیں ماسٹر عبدالرحمٰن کے گھر سے اُٹھ رہی تھیں۔ ہم اندر گئے۔ ماسٹر کی بیوی چیخ چیخ کر رو رہی تھی۔ اُس نے بتایا کہ ماسٹر کو جگایا تو دیکھا کہ وہ مرا ہُوا ہے۔

ہم اندر گئے۔ میت چارپائی پر تھی۔ مجھے کچھ شک ہُوا۔ میں نے تکیے کے نیچے ہاتھ پھیرا۔ کچھ نہ ملا۔ چارپائی کے نیچے دیکھا۔ مجھے وہ شیشی نظر آ گئی جس میں

زہر تھا۔ خالی شیشی چارپائی کے پائے کے قریب گری ہوئی تھی۔

ماسٹر عبدالرحمٰن نے اپنے آپ کو اپنے ذہن کے دوزخ سے آزاد کرالیا تھا۔

انسان کی درندگی

سفرنامے لکھنے کا خبط اور سیاحت کا جنون مجھے عزب الہند کے ایک دُور افتادہ گوشے میں لے گیا۔ میں چھوٹے سے ہوٹل میں بیٹھا کافی پی رہا تھا، مجھ پہ انکشاف ہُوا کہ یہاں کے لوگوں کو میرے متعلق خاصی واقفیت حاصل ہو چکی ہے۔ وہ اس طرح کہ ایک خوش پوش آدمی، ڈورن گریگری میرے پاس آ بیٹھا۔ اپنا تعارف کرا کے اُس نے مجھے اپنے متعلق بتایا۔ وہاں اس کے کافی کے باغات تھے اور کم و بیش تین سو عزب الہندی اس کے باغوں میں کام کرتے تھے۔ یہ لوگ بال بچوں سمیت ان باغوں کے گرد و نواح میں آباد تھے۔ گریگری نے مجھے بتایا کہ لکھنے کے لئے یہاں بہت مواد ہے اور ایسا مواد جو مہذب دنیا کو حیرت میں ڈال دے گا۔ گریگری خود بھی لکھتا تھا۔ اُس نے اس خطۂ زمین کی بہت تعریف کی اور کہا کہ اسے اور اس کے بیوی بچوں کو یہاں کی سادگی بہت پسند ہے۔ کیونکہ یہاں قدرت کے اصلی رنگ دیکھنے میں آتے ہیں۔ نہ ماحول میں تصنّع ہے نہ انسانوں میں۔ اس دیس میں کوئی تحریری قانون نہیں ہے پھر بھی لوگ امن و امان سے رہتے ہیں اور بدکرداروں کو خود ہی سزا دے لیتے ہیں۔

گریگری نے مجھے اپنے گھر مدعو کیا۔ میں گیا اور اس کے گھر کو گھنے جنگل میں نہایت دلکش پایا۔ ماحول بہت ہی پیارا تھا۔ اُس روز کے بعد میں اس کے ہاں جانے لگا۔ بعض راتیں بھی وہاں گزاریں۔ رات کے وقت گریگری کے مزارعوں کی بستی سے موسیقی کی پُرلطف صدائیں شب کی تیرگی پر وجد طاری کرتی رہتی تھیں۔ جی میں آئی کہ گریگری سے کہوں کہ مجھے بھی اپنے فارم میں ملازم رکھ لے اور میں تمام عمر اسی پُرسکون ماحول میں گزار دوں، مگر میں جب اس ماحول میں گھومنے پھرنے لگا

تو مجھ پر ہول طاری ہونے لگا۔

ایک روز گر یگری نے مجھے کھدی ہوئی ایک قبر دکھائی۔ اس کے قریب چند اور قبریں تھیں جن میں لاشیں دفن تھیں۔ گریگری نے مجھے بتایا کہ یہ قبر ایک چور کے لئے کھودی گئی ہے اور ان قبروں میں چور دفن ہیں۔ گریگری نے بتایا کہ جب کافی کے پودوں کے بیج تیار ہو جاتے ہیں تو یہ بیج نقدی جتنے قیمتی ہوتے ہیں۔ اگر کوئی مٹھی بھر بیج چرا لے جاتے تو ان کے عوض وہ نوٹوں کا موٹا بنڈل حاصل کر سکتا ہے۔ گریگری نے رائفلوں اور چھروں سے مسلح چوکیدار رکھے ہوتے تھے۔ اگر کوئی چور موقع پر پکڑا جاتے تو اسے چھرے سے نہ صرف ہلاک کر دیا جاتا ہے بلکہ اس کا چہرہ بری طرح بگاڑ دیا جاتا ہے۔ ایک قبر ہر وقت کھدی رہتی ہے۔ چور کو قبر میں پھینک کر اوپر مٹی ڈال دی جاتی ہے اور ایک اور قبر کھود کر نئے چور کے لئے تیار کر لی جاتی ہے۔ گریگری نے مجھے بتایا کہ اس قبرستان میں میرے دو چوکیدار بھی دفن ہیں۔ انہیں مزارعوں نے چوری کرتے پکڑا تھا اور انہیں درندوں کی طرح ہلاک کر کے قبروں میں دفن کر دیا تھا۔

"یہ لوگ توہم پرست ہیں" —— گریگری نے کہا —— "میں جانتا ہوں کہ ان کے توہمات بے بنیاد ہیں لیکن میں ان کے خیالات میں کوئی انقلاب نہیں لانا چاہتا ورنہ ان کا اصلی روپ بگڑ جاتے گا۔"

دراصل گریگری کو اپنے کافی کے باغوں سے اور دولت سے دلچسپی تھی۔ اُس کا فرض تھا کہ وہ عزب الہند کے پسماندہ لوگوں کے ذہنوں میں انقلاب لانے کی کوشش کرتا، مگر وہ ان میں گھل مل کر ان کے توہمات کو قبول کرتا چلا جا رہا تھا۔

ایک رات میں اکیلا ہی مزارعوں کے قریبی گاؤں میں چلا گیا۔ گاؤں کے تمام مرد، عورتیں اور بچے کھلے میدان میں بیٹھے گا بجا رہے تھے۔ میں قریب جا کر اندھیرے میں رُک گیا۔ سات آٹھ نوجوان لڑکیاں ہجوم کے درمیان آئیں۔ سازندوں نے نئی دھن چھیڑ دی۔ ہجوم نے کوئی گیت گنگنانا شروع کر دیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے پیڑ پودے بھی گنگنا رہے ہوں۔ لڑکیوں کے متحرک جسموں نے مجھ پر سحر طاری

کر دیا۔ میں نے اس طرح کا کیف آور ناچ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ لڑکیوں کے ہونٹوں پر جو مسکراہٹ تھی اس میں قدرت کی رعنائیاں اور پھولوں کا تبسم سمویا ہوا تھا۔

مجھ پر بے خودی سی طاری ہو گئی اور میں کشاں کشاں لوگوں کے قریب چلا گیا۔ مزارعوں کے تین چار نمبردار مجھے جانتے تھے۔ اُنہوں نے میری طرف دیکھا اور مسکرا دیئے مگر انہوں نے نغمے کی تان نہ توڑی اور بدستور ہجوم کے ساتھ گنگناتے رہے۔ وسط میں لکڑیوں کا انبار جل رہا تھا اور لڑکیاں اس الاؤ کے گرد ناچ رہی تھیں۔ بے اختیار جی چاہنے لگا کہ میں انگلستان کا یہ لباس اتار پھینکوں اور ان جنگلیوں کے کپڑے پہن کر اس محفل میں جذب ہو جاؤں۔

اچانک نغمے کی تان ٹوٹ گئی۔ ناچنے والی لڑکیاں چونک کر رک گئیں اور جہاں جہاں کھڑی تھیں وہیں بیٹھ گئیں۔ ڈیڑھ دو سو انسانوں کے ہجوم پر سناٹا طاری ہو گیا۔ جو کھڑے تھے وہ بیٹھ گئے اور جو بیٹھے تھے انہوں نے نظریں زمین پر گاڑ دیں۔ ایسا سکوت کہ مجھ پر دہشت طاری ہونے لگی۔ میں نے ان لوگوں کے چہروں کو دیکھا۔ وہ سب دہشت زدہ معلوم ہوتے تھے۔ بعض کنکھیوں سے ایک طرف دیکھ رہے تھے۔

اس ہُو حق خاموشی میں مجھے ایک طرف ایسی آہٹ سنائی دی جیسے کوئی پاؤں کو گھسیٹ گھسیٹ کر آہستہ آہستہ چلا آ رہا ہو۔ ہجوم میں بعض نے اُس طرف دیکھا اور سہم کر نظریں جھکا لیں۔ میں نے بھی اس طرف دیکھا تو مجھے آگ کی روشنی سے دُور کسی انسان کا متحرک سایہ نظر آیا۔ وہ انسان ہی تھا۔ قریب آیا تو دیکھا کہ وہ تیرہ چودہ سال کی عمر کا لڑکا تھا۔ اُس کے چہرے پر درد اور خوف کا گہرا تاثر تھا۔ آنکھیں لال سرخ اور وہ کچھ آگے کو جھکا ہوا تھا۔ وہ آگ کے اس قدر قریب آ گیا کہ میں اس کے چہرے کا ایک ایک نقش آسانی سے دیکھ سکتا تھا۔ انسانوں کے اتنے بڑے انبوہ میں یہی لڑکا تھا جو کچھ حرکت کر رہا تھا یا الاؤ کے شعلے تھے جو بھیانک سی آواز سے اوپر اُٹھ رہے تھے۔

میری نظریں جب لڑکے کے چہرے سے پھسل کر اس کے پاؤں کی طرف گئیں تو میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا اور خوف سے میرا مُنہ کھُل گیا۔ اس کی

دائیں ٹانگ سے گوشت کے دو بڑے بڑے لوتھڑے لٹک رہے تھے جن سے گندا خون بہہ رہا تھا۔

جہاں سے ٹانگ سلامت تھی وہاں سے سوجی ہوئی تھی۔ گھٹنے کے قریب سے اس کی ٹانگ کی ہڈی صاف نظر آ رہی تھی۔ اتنے بڑے بڑے زخم گل سڑ رہے تھے اور لڑکے کی آنکھیں درد کی شدت سے اُبل کر باہر آ رہی تھیں۔

میں نے بھاگ کر لڑکے کو سنبھال لینا چاہا مگر یوں محسوس ہوا جیسے میرے پاؤں زمین نے جکڑ لیے ہوں یا شاید میری ٹانگیں مفلوج ہو گئی ہوں۔ میرا دماغ سوچنے سے معذور ہو گیا۔ اُس وقت کچھ ایسے لگا جیسے ان لوگوں کی توہم پرستی بے بنیاد نہیں تھی ورنہ اس بُری طرح زخمی لڑکے کو دیکھ کر میں یوں کھڑا نہ رہتا۔ مجھ پر کسی غیبی قوت نے غلبہ پا لیا تھا۔ جس نغمے اور موسیقی نے مجھ پر سحر طاری کر دیا تھا وہ اب ہیبت ناک آواز بن کر میرے ذہن میں گونجنے لگی۔ میں اپنے آپ پر آسیب کا اثر محسوس کرنے لگا۔

لڑکا آگ کے قریب رُکا۔ اُس نے آگ کو گھورا۔ گھوما اور پھر زخمی ٹانگ کو گھسیٹتا چل پڑا۔ اس کی ٹانگ اس حد تک گل سڑ گئی تھی کہ کوئی بھی ڈاکٹر دیکھتا تو اسے جسم سے الگ کر دیتا۔ لڑکا ہجوم سے ذرا پرے چلا گیا تو اچانک میرے جسم میں جان آ گئی۔ میں اُس کے پیچھے دوڑ پڑا لیکن مزارعوں کے ایک نمبردار نے مجھے بازو سے پکڑ کر خوفزدہ آواز میں کہا ——"اس کے پیچھے مت جاؤ۔ شکر کرو وہ چلا گیا ہے"۔

"تم نے اس کا زخم نہیں دیکھا؟"—— میں نے گھبرا کر کہا ——"میں اسے اٹھا لے جاؤں گا۔ اس کے زخم کا علاج کروں گا۔ یہ کس کا بچہ ہے؟"

دو اور آدمی میرے سامنے آ کھڑے ہوتے۔ ایک نے سنجیدگی سے اور دبی دبی آواز میں کہا ——"پاگل نہ بنو۔ وہ چلا گیا ہے"۔

"کہاں چلا گیا ہے؟"—— میں نے کہا ——"میں اس کے پیچھے جاؤں گا۔ وہ دُور نہیں گیا"۔

وہ لوگ مجھے یوں پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھنے لگے جیسے میں واقعی

پاگل ہو گیا ہوں: میں نے غصے سے کہا ۔۔۔ "تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے؟ تم درندے تو نہیں، اچھے بھلے انسان ہو۔ مجھے اس لڑکے تک جانے دو۔"

"تم اب اسے نہیں پا سکو گے" ۔۔۔ نمبردار نے کہا ۔۔۔ "وہ مر جائے گا۔ ہم خوش نصیب ہیں کہ وہ آج رات نہیں تو کل رات مر جائے گا۔"

"میں تم لوگوں کو اپنا دوست سمجھتا تھا" ۔۔۔ میں نے انہیں کہا ۔۔۔ "مگر افسوس ہے کہ تم میں انسانیت نہیں ہے۔"

"اسی لئے تو ہم تمہیں اس لڑکے کے پیچھے جانے سے روک رہے ہیں کہ تم ہمارے دوست ہو" ۔۔۔ ایک بوڑھے مزارع نے کہا ۔۔۔ "تم ہمارے عزیز مہمان ہو۔ ہم نہیں چاہتے کہ تمہیں بھی یہ لڑکا چیر پھاڑ دے۔"

"چیر پھاڑ دے؟" ۔۔۔ میں نے حیرت زدہ ہو کے پوچھا۔

"ہاں!" ۔۔۔ نمبردار نے کہا ۔۔۔ "وہ انسانوں کی طرح نظر آتا ہے لیکن دراصل درندہ ہے۔ وہ انسان نہیں ہے۔"

اس وقت مجھے یاد آیا کہ گرگیری نے مجھے بتایا تھا کہ ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ بعض انسان دن کے وقت انسانوں کے روپ میں پھرتے رہتے ہیں اور وہ رات کو درندے بن کر راہ جاتے لوگوں اور مویشیوں کو چیر پھاڑ کر کھا جاتے ہیں۔ میں اس پر ہنس دیا تھا۔ پھر گرگیری سے کہا تھا کہ آؤ یہاں اس توہم پرستی کے خلاف مہم چلائیں اور ان لوگوں کو زندگی کے حقائق سے روشناس کرائیں اور انہیں ان کی اُن قوتوں سے آگاہ کریں جو ہر انسان میں موجود ہوتی ہیں۔ انسان توہم پرستی کو صرف اس حالت میں قبول کرتا ہے جب وہ اپنی ڈھکی چھپی قوتوں سے آگاہ نہیں ہوتا۔ لیکن گرگیری نے مجھے اس مہم سے روک دیا تھا اور کہا تھا کہ ان لوگوں کو دُور سے دیکھتے رہنا، مداخلت کی کوشش نہ کرنا۔

اُس رات میں نے اس لڑکے کو اس بُری حالت میں دیکھا اور لوگوں کو یہ کہتے سنا کہ وہ درندہ ہے تو میں چُپ ہو رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں ڈر بھی گیا تھا کہ کہیں یہ لوگ مجھے قتل ہی نہ کر دیں۔ میں گرگیری کے گھر چلا گیا اور اسے

سارا ماجرہ کہہ سنایا۔ اُس نے نہایت تحمل سے کہا ــــ "بیٹھو اور سگریٹ پیو۔ جو کچھ تم نے دیکھا ہے اسے بھول جاؤ"ــــ اس نے مجھے سگریٹ دیا اور سلگا کر بولا ــــ "مجھے اس لڑکے کے متعلق سب کچھ معلوم ہے۔ اس کی زندگی ختم ہو چکی ہے۔ وہ اس حقیقت سے آگاہ ہے۔ کوئی بھی اس کی مدد نہیں کر سکتا، نہ کوئی مدد کرنا چاہے گا نہ کوئی تمہیں اجازت دے گا کہ اس کی مدد کرو۔ میرے دوست! وہ انسان نہیں فی الواقع درندہ ہے۔"

"گریگری!"ــــ میں نے حیرت سے کہا ــــ "تم تو تعلیم یافتہ اور تہذیب یافتہ انسان ہو۔ کیا تم بھی ان لوگوں کے اس ظالمانہ وہم کے قائل ہو؟"

"تم میرے مہمان ہو"ــــ اُس نے کہا ــــ "میں تمہاری سلامتی کا ذمہ دار ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ تم ان لوگوں کے عقائد میں دخل اندازی کر کے قتل ہو جاؤ۔ سنو۔ میں تمہیں ساری کہانی سناتا ہوں"ــــ اس نے سنایا :

"اس لڑکے کا باپ بھی درندہ تھا۔ وہ دن کے وقت لوگوں کے ساتھ کام کاج کیا کرتا تھا لیکن رات کے وقت بہت بڑا چمگادڑ بن جاتا تھا۔ وہ راتوں کو مویشیوں کی آنکھیں نکال دیا کرتا تھا۔"

"کسی نے اُسے چمگادڑ کے روپ میں دیکھا یا پہچانا تھا؟"

"ہاں!"ــــ گریگری نے کہا ــــ "جب کئی ایک خوبصورت گھوڑوں اور دُودھ دینے والی کئی گائیوں کی آنکھیں نکل گئیں تو لوگوں نے مویشیوں کی رکھوالی شروع کر دی۔ ایک رات انہوں نے ایسا چمگادڑ دیکھا جو گِدھ سے بھی بڑا تھا۔ لوگوں نے اسے تیروں سے مارنا چاہا مگر وہ نہ مر سکا۔ آخر بندوقیں لائی گئیں اور کئی راتوں بعد وہ نظر آیا اور اسے گولی ماری گئی۔ وہ رات کی تاریکی میں غائب ہو گیا۔ دوسرے دن لوگوں نے دیکھا کہ اس لڑکے کا باپ جنگل میں مرا پڑا تھا۔"

"وہ کسی اور وجہ سے مر گیا ہو گا۔"

"نہیں!"ــــ گریگری نے کہا ــــ "یہ ثبوت تھا کہ وہ درندہ ہے مرنے کی کوئی اور وجہ نہیں تھی .... اس روز کے بعد لوگوں نے اس لڑکے پر کڑی نظر

رکھ لی۔ خدشہ تھا کہ اس باپ کے بیٹے میں بھی درندہ بننے کی استطاعت ہو گی۔ چند دنوں بعد مزارعوں نے بتایا کہ ان کی مرغیاں غائب ہونے لگی ہیں۔ بعد میں مرغیوں کے پَر اور بچے کھچے حصے جنگل میں بکھرے ہوتے ملنے لگے۔ ایک رات دو کتوں نے اس درندے کا تعاقب کیا جو مرغیوں کو اٹھا لے جاتا تھا لیکن کتے واپس نہ آئے۔ دوسرے دن دونوں کتے چیرے پھاڑے ہوئے جنگل میں پڑے تھے۔ پھر ایک رات ایک پالتو بلی کو یہ درندہ اُٹھا لے گیا — دوسرے دن بلی کی دو ٹانگیں بستی سے پرے پڑی ملیں ....

"بستی والے چھُروں سے مسلح ہو کر راتوں کو چھُپ چھُپ کر دیکھنے لگے۔ ایک رات انہوں نے ایک بھیڑیئے کو دیکھا۔ وہ بستی میں داخل ہو رہا تھا۔ ایک آدمی قریب ہی چھُپا ہُوا تھا۔ جب بھیڑیا اس کے قریب سے گزرا تو اس آدمی نے پیچھے سے اس پر چھُرے سے وار کیا۔ چھُرا اس کی پچھلی دائیں ٹانگ کو لگا۔ بھیڑیا گھوما لیکن گر پڑا۔ اس آدمی نے اسی ٹانگ پر دوسرا وار کیا اور خاصا گوشت کاٹ دیا۔ بھیڑیا اُٹھا اور بھاگ گیا۔ دوسری صبح لوگوں نے دیکھا کہ اس لڑکے کی دائیں ٹانگ دو جگہوں سے کٹی ہوئی تھی اور گوشت لٹک رہا تھا۔ بستی والوں کو یقین ہو گیا کہ یہی لڑکا ہے جو رات کو بھیڑیا بن جاتا ہے۔"

"اس کے گھر والوں نے اس کی مرہم پٹی نہیں کی؟"

"نہیں!" — گریگری نے کہا — "یہاں کا کوئی انسان درندے کو گھر نہیں رکھ سکتا۔ اس کی ماں ہے لیکن اس نے اس کی مرہم پٹی نہیں کرائی نہ کوئی مرہم پٹی کے لئے تیار ہوتا ہے۔ اسے اسی زخم سے مرنا ہے۔"

میں نے گریگری کو قائل کرنے کی بہت کوشش کی کہ وہ میرے ساتھ تعاون کرے اور مجھے اس لڑکے کے گھر تک لے جائے۔ میں اسے یہاں سے اٹھا لے جاؤں گا اور ان لوگوں کو ثابت کر دکھاؤں گا کہ وہ درندہ نہیں ہے لیکن گریگری نے کہا کہ اگر ہم نے ان لوگوں کے عقائد میں دخل اندازی کی تو یہ لوگ یہاں سے چلے جائیں گے اور کوئی بھی میرے باغ میں کام کرنے نہیں آئے گا۔ بہرحال میرے اصرار پر اس نے مجھے اپنی رائفل دے دی اور اس

لڑکے کے جھونپڑے کا راستہ بتا کر کہا کہ جاؤ، جو کچھ کرنا چاہتے ہو خود کرو۔ اور اگر کوئی خطرہ پیش آتے تو یہ رائفل استعمال کر لینا، لیکن یاد رکھو کہ اگر تمہیں کسی نے اس کے جھونپڑے میں جاتے یا آتے دیکھ لیا تو وہ تمہیں بخشے گا نہیں۔ یہ لوگ عموماً پیچھے سے چھُرے کا وار کیا کرتے ہیں۔

میں رائفل کی میگزین میں گولیاں ڈال کر چل پڑا۔ میں ہر خطرہ مول لے کر اس لڑکے کی جان بچانا چاہتا تھا۔ اس کا جھونپڑا بستی سے ذرا الگ تھا۔ میں بستی کا چکر کاٹ کر جھونپڑے تک پہنچ گیا۔ میں نے رائفل سیدھی کر رکھی تھی۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ کوئی بھی انسان میری راہ میں آیا اُسے گولی مار دوں گا۔

جھونپڑے کا دروازہ کھلا تھا۔ صحن میں گُپ اندھیرا تھا۔ میں دبے پاؤں اندر چلا گیا۔ آگے گھاس پھوس کا ایک کمرہ تھا جس میں دیا جل رہا تھا۔ میں اندر داخل ہُوا تو تعفن سے دماغ پھٹنے لگا۔ کمرے میں ہلکی سی چیخ سنائی دی۔ دیئے کی مدھم روشنی میں مجھے ایک عورت اکڑوں بیٹھی نظر آئی۔ اس نے التجا کی —"وہ مر چکا ہے۔ اس پر گولی نہ چلانا میرا بچہ مر چکا ہے۔"

میں نے دائیں طرف دیکھا چارپائی پر وہی لڑکا پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ چہرے پر شدید درد کا تاثر تھا اور وہ مرا ہُوا تھا۔

"میں اسے مارنے نہیں، بچانے آیا تھا" — میں نے اس کی ماں سے کہا —"یہ کس طرح زخمی ہُوا تھا؟"

"یہ نہیں بتاؤں گی" — اس نے خوفزدہ لہجے میں کہا —"میں نے سچی بات بتا دی تو لوگ مجھے بھی قتل کر دیں گے۔"

"کیا یہ رات کے وقت بھیڑیا بن جاتا تھا؟"

"نہیں، یہ رات بھر میرے پاس سوتا تھا۔"

"پھر زخمی کیسے ہُوا؟"

"نہیں بتاؤں گی۔"

"اس کا باپ کس طرح مرا تھا؟"

اس نے سہمی ہوئی نظروں سے دروازے کی طرف دیکھا پھر اِدھر اُدھر

دیکھا جیسے دیکھ رہی ہو کہ کوئی سن تو نہیں رہا۔ پھر رازداری سے بولی ——
"اُسے سانپ نے ڈس لیا تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ رات کو خونخوار چمگادڑ بن جاتا تھا لیکن یہ غلط ہے۔ اُس رات لوگوں نے نہ جانے کس پر گولی چلائی۔ دوسری صبح میرا خاوند بہت سویرے کسی کام سے جنگل میں چلا گیا۔ بہت دیر بعد لوگوں نے میرے جھونپڑے کو گھیر لیا اور مجھے گالیاں دے دے کر کہنے لگے کہ تمہارا خاوند خونخوار چمگادڑ تھا۔ وہ رات گولی سے مر گیا ہے۔ میں نے جا کر دیکھا۔ اس کی لاش جنگل میں پڑی تھی۔ کوئی اس کے قریب نہ جاتا تھا۔ میں نے اس کے جسم کا جائزہ لیا۔ اس کے دائیں ٹخنے پر سانپ کے دانتوں کے نشان صاف نظر آ رہے تھے۔ نرم زمین پر سانپ کی لکیر بھی میں نے دیکھی تھی۔ میں نے سانپ کے ڈسے ہوتے لوگ اکثر دیکھے ہیں۔ میرے خاوند کو بھی سانپ نے ڈسا تھا۔ مگر میں نے کسی کو نہیں بتایا ورنہ لوگ مجھے بھی قتل کر دیتے۔ میں نے بھی کہہ دیا کہ ہاں میرا خاوند رات کو درندہ بن جایا کرتا تھا۔"

"میں کسی کو نہیں بتاؤں گا" —— میں نے اُس کے سر پہ ہاتھ رکھ کر کہا —— "مجھے بتا دو کہ لڑکا کس طرح زخمی ہوا تھا۔"

اُس نے سرگوشی کے لہجے میں کہا —— "پہلے وعدہ کرو کہ میری بات سن کر مجھے گولی مار دو گے۔ اگر تم نے گولی نہ ماری تو یہ لوگ مجھے پتھروں سے بے دردی سے قتل کریں گے۔"

میں نے وعدہ کر لیا۔

"میرے بیٹے کو نمبردار نے چھرے مارے تھے" —— عورت نے لرزتی آواز میں کہا —— "اور اُس نے مجھے دھمکی دی تھی کہ میں نے کسی کو بتایا کہ اسے نمبردار نے زخمی کیا ہے تو وہ میرا بھی یہی حشر کرے گا۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ وہ مجھے اپنی بیوی بنانا چاہتا تھا" —— عورت نے کہا —— "میں بچے کے باپ کو بہت چاہتی تھی۔ میں نے نمبردار سے کہا کہ میں اسی سے ... میں بہت اچھا گاتی اور ناچتی تھی۔ یہاں کے لوگ ناچنے اور

گانے والی بیوی پر بہت فخر کیا کرتے ہیں۔ نمبردار کی پہلے ہی پانچ بیویاں تھیں۔ وہ مجھے بھی اپنے گھر میں رکھنا چاہتا تھا، مگر میں نہ مانی۔ اُس وقت اس کا باپ نمبردار تھا۔ میں نے اس بچے کے باپ سے شادی کر لی۔ تیرہ چودہ سال بعد نمبردار کا باپ مرگیا تو نمبرداری اسے مل گئی۔ اس نے مجھے پھر کہا کہ میں اس کے گھر آجاؤں لیکن میں نے انکار کر دیا۔ ہم لوگ اس عقیدے کو مانتے ہیں کہ بعض انسان رات کے وقت درندے بن جاتے ہیں۔ اس سے پہلے یہاں کتنی لوگ اسی طرح مارے گئے ہیں۔ میں بھی اسی عقیدے کو مانا کرتی تھی مگر اب نہیں۔ میرا خاوند سانپ کے ڈسنے سے مرا تھا۔ نمبردار کو انتقام لینے کا موقع مل گیا۔ اس نے میرے بچے کے متعلق مشہور کر دیا کہ یہ درندہ ہے۔ جس رات لوگوں نے بھیڑیئے کو دیکھا اور اسے زخمی کیا تھا اسی رات نمبردار کلہاڑا لے کر میرے گھر میں گھس آیا اور لڑکے کی بائیں ٹانگ سے کلہاڑیوں کی دو ضربوں سے گوشت الگ کر دیا۔ اگلے روز اس نے سارے گاؤں کو دکھایا کہ یہ دیکھو، رات یہی لڑکا بھیڑیئے کے روپ میں نظر آیا تھا۔ لوگوں کا عقیدہ پہلے ہی پختہ تھا، وہ مان گئے۔ یہ دس بارہ دن پہلے کا واقعہ ہے۔"

"لڑکا آج رات ناچ گانا دیکھنے گیا تھا؟" ——میں نے کہا—— "میں نے اسے وہاں دیکھا تھا۔"

"نہیں!" ——عورت نے کہا—— "اسے میں نے وہاں بھیجا تھا۔ میں نے اسے کہا تھا کہ جاؤ، سارا گاؤں جمع ہے۔ سب کے درمیان کھڑے ہو کر کہو کہ مجھے نمبردار نے گھر میں آکر کلہاڑے سے زخمی کیا تھا کیونکہ وہ میری ماں کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا اور میری ماں نے انکار کر دیا تھا۔ لڑکا جانا نہیں چاہتا تھا۔ مجھ میں ہمت نہیں تھی کہ بھرے گاؤں میں ایسی بات کہتی۔ میرے اصرار پر لڑکا چلا گیا اور واپس آگیا۔ میں نے پوچھا کہ اس نے گاؤں والوں کو بتایا ہے؟ اس نے نفی میں سر ہلایا اور چارپائی پر گر پڑا۔ میں اس کے قریب گئی تو وہ مر چکا تھا۔ اس کا زخم بہت خراب ہو گیا تھا۔"

"تم نے گرگری کو یہ بات کیوں نہیں بتائی؟"

"وہ صرف نمبرداروں کی بات سنتا اور مانا کرتا ہے" —— اس نے کہا اور التجا کے لہجے میں بولی —— "اب مجھے گولی مار دو۔ میری بات ضرور کوئی سن رہا ہوگا۔ گولی کی موت اچھی ہوتی ہے۔ انسان جلدی مرجاتا ہے۔ میں چھرے سے نہیں مرنا چاہتی۔"

میرا تو دماغ بھی سُن ہوگیا تھا۔ میں سر جھکا کر گھوما اور باہر نکل آیا۔ عورت کی سرگوشیاں سناتی دیتی رہیں —— "مجھے گولی مار جاؤ، مجھے گولی مار جاؤ۔"

گر بگڑی میرا منتظر تھا۔ دیکھتے ہی بولا —— "دیکھ آتے اسے؟ ابھی زندہ ہے؟" —— میرے جی میں آئی کہ گر بگڑی کو گولی مار دوں لیکن اتنی ہمت نہ ہوتی۔ میں کچھ کہے بغیر راتفل اس کے سامنے پھینک کر اپنے کمرے میں چلا۔ رات بھر بے چین رہا۔ پچھلے پہر آنکھ لگی۔ آنکھ کھلی تو صبح کے گیارہ بج رہے تھے۔ باہر نکلا تو گر بگڑی نے پہلی خبر یہ سناتی کہ لڑکے کی ماں چڑیل بن گئی تھی، صبح ہی صبح چیخیں مارتی باہر نکلی اور کتی آدمیوں کے چہرے ناخنوں سے لہولہان کر دیتے۔ بڑی مشکل سے نمبردار اور دو آدمیوں نے اسے چھرے سے مارا ہے۔

"وہ مرگئی ہے؟" —— میں نے دکھ زدہ لہجے میں پوچھا۔

"ہاں! وہ اسے جنگل میں پھینک آتے ہیں۔"

میں نے گر بگڑی کو ساری بات کہہ سناتی تو اس نے لاپرواہی اور بے رُخی سے کہا —— "میں ان لوگوں کی زندگی میں دخل نہیں دینا چاہتا ورنہ میری زندگی تباہ ہوجاتے گی۔"

آج بھی ان لوگوں کا نغمہ اور ان لڑکیوں کا ناچ یاد آتا ہے تو میں اپنے اوپر آسیب کا بھیانک اثر محسوس کرتا ہوں۔

ماں اور مہمان

راتوں کو چلنے والے تیز چلا کرتے ہیں مگر وہ آہستہ آہستہ چلا جا رہا تھا جیسے چہل قدمی کے لئے نکلا ہو۔ چند قدم دُور چل کر وہ رُکتا تھا، پیچھے دیکھتا تھا، آگے دیکھتا تھا اور ایک بار پھر رُکنے کے لئے چل پڑتا تھا۔

وہ سَیر کے لئے نہیں نکلا تھا۔ وہ وقت سَیر کا نہیں تھا اور وہ جگہ بھی سَیر کے لئے نہیں تھی۔ دیہاتی علاقے کی ایک پگڈنڈی تھی جس کے دونوں طرف کہیں کہیں درخت خاموش کھڑے تھے جیسے گہری نیند سو رہے ہوں —— وہ وقت گہری نیند کا تھا۔ آدھی رات ہونے کو آئی تھی۔ وہ کوئی سَیرگاہ نہیں تھی، ویرانہ تھا۔ وہاں سے قریبی گاؤں کم و بیش دو میل دُور تھا

چاند آب و تاب سے چمک رہا تھا۔

وہ خراماں خراماں چلتے کیکر کے پیڑ کے نیچے رُک گیا۔ اُس کی نظریں پگڈنڈی پر دُور آگے چلی گئیں اور اُس جگہ سے واپس آ گئیں جہاں سے پگڈنڈی نشیب میں اُتر جاتی تھی۔ اُس کی نظریں پگڈنڈی پر پیچھے کو چلی گئیں۔ اچانک کیکر سے ایک شور اُٹھا۔ اُس نے بدک کر اُوپر دیکھا۔ ایک چکور چیختا چلاتا چاند کی طرف اُڑا جا رہا تھا۔ اُسے چکور کی چیخ و پکار سنائی دے رہی تھی۔ چکور نظر نہیں آ رہا تھا۔

چکور کے واویلے نے گیدڑوں کو بیدار کر دیا۔ بہت سے گیدڑ اکٹھے بول پڑے اور کچھ دیر ٹوٹی پھوٹی چیخوں کی زبان میں بولتے رہے۔

"گیدڑ" —— اُس نے دل ہی دل میں اپنے آپ سے کہا —— "بزدل .... دن کو کہیں نظر نہیں آتے، رات کو نہ جانے کیسے

للکارتے ہیں۔"

"میں بھی رات کو ہی شیر ہوتا ہوں" —— اُس نے سوچا مگر اِس سوچ کو اُس نے یوں اپنے ذہن میں دبا لیا جیسے پاؤں تلے جلتا ہوا سگریٹ مسل رہا ہو —— "نہیں۔ میں دن کو بھی شیر ہوتا ہوں .... میں گیدڑ نہیں۔ میری للکار پر سب سہم جاتے ہیں۔"

اُس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کلہاڑی اوپر اُٹھائی اور کیکر کی خاردار ٹہنیوں میں سے چھن چھن کر آتی چاندنی میں کلہاڑی کے پھل کو دیکھا۔ لوہا چمک رہا تھا۔ اُس نے محسوس کیا جیسے اپنے ہاتھ میں کلہاڑی دیکھ کر اُس کا سینہ پھیل گیا ہو۔

"کیا آج کوئی نہیں آئے گا؟" —— اُسے خیال آیا اور مایوسی سے اُس کا سینہ سکڑنے لگا۔ اُس نے اپنے آپ کو حوصلہ دیا —— "تھوڑی دیر اور رُک جاؤ۔ شاید کوئی بد قسمت آ ہی نکلے۔"

اُس نے اُس نشیب کی طرف دیکھا جس میں پگڈنڈی اُتر جاتی تھی۔ اُسے ایک آدمی نشیب میں سے اُبھرتا نظر آیا۔ اُسے دیکھ کر وہ کیکر کے تنے کی اوٹ میں ہو گیا اور ایک آنکھ آگے کر کے دیکھنے لگا۔ وہ آدمی تیز تیز چلا آ رہا تھا۔ وہ جب کیکر کے پیڑ کے قریب سے گزرنے لگا تو دبی دبی للکار نے اُسے روک لیا۔

"ٹھہر جا بھائی اوئے!" —— کیکر سے ہٹ کر وہ رات کے مسافر کے سامنے جا کھڑا ہوا اور بولا —— "اپنی جیب میرے ہاتھ میں خالی کر دو اور اپنی جان سلامت لے کر چلے جاؤ۔ یہ کلہاڑی دیکھ لو۔"

اُس آدمی نے کلہاڑی والے کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور یوں سکون کی آہ لی جیسے وہ بہت بڑے خطرے سے نکل آیا ہو۔

"جلدی کرو بھائی!" —— اُس نے اجنبی سے کہا —— "میں نے کسی کو کبھی اتنی مہلت نہیں دی۔"

وہ آدمی جس کی عمر پچاس برس سے خاصی آگے نکل گئی تھی، یوں زمین

پر بیٹھ گیا جیسے تھکا ماندہ مسافر منزل پر آگرا ہو۔

"تم مجھ سے ڈرتے نہیں؟ .... میں رہزن ہوں" — اُس نے کہا — "میرے ہاتھ میں کلہاڑی ہے۔ اپنی جیب میرے آگے خالی نہیں کرو گے تو میں تمہیں قتل کر دوں گا۔"

اُس آدمی نے ڈرے بغیر اُوپر دیکھا۔ اپنے سر پر کھڑے نوجوان رہزن کا ہاتھ پکڑا اور نیچے کو کھینچا۔

"بیٹھ جا کاکا!" — اُس نے بڑے اطمینان سے کہا — "میری ایک ہی جیب ہے۔ خود ہی خالی کر لینا۔ میں خالی ہاتھ ہوں۔ تمہارا مقابلہ نہیں کر دوں گا۔"

"تم خالی ہاتھ نہ ہوتے تو بھی میرا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے" — نوجوان رہزن نے کہا — "تم بوڑھے ہو۔ میں تمہیں کلہاڑی دے دیتا ہوں میں خالی ہاتھ تمہارا مقابلہ کروں گا .... لیکن میں تمہیں قتل نہیں کرنا چاہتا۔ تمہاری جیب میں قارون کا خزانہ تو نہیں ہوگا۔ تھوڑے سے پیسوں پر اپنی جان کیوں گنواتے ہو؟"

وہ آدمی ہلکی سی ہنسی ہنسا اور رہزن کو اُس کا بازو کھینچ کر بٹھا لیا۔

"یہ کام کب سے شروع کیا ہے؟" — اُس نے رہزن سے پوچھا —

"تم ابھی بچے ہو۔"

"میں کہتا ہوں تم ...."

"ہر کام میں عقل کی ضرورت ہوتی ہے" — اُس آدمی نے نوجوان رہزن کی بات کاٹتے ہوئے کہا — "رہزنی میں تو عقل کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے .... کسی کی شاگردی کی ہے؟"

"نہیں" — رہزن کے مُنہ سے بے اختیار "نہیں" نکل گیا لیکن وہ سنبھل گیا اور تنک کر بولا — "لیکن میرے ہمدرد بن کر تم مجھ سے بچ نہیں سکتے۔ ابھی تم وعظ شروع کر دو گے کہ دوسروں کو لُوٹنا گناہ ہے .... میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں۔ شیر اپنے شکار کو چھوڑا نہیں کرتا۔"

"نہیں میرے عزیز!" ——— رہزن کے شکار نے کہا ——— "میں تو کہہ رہا ہوں کہ تھوڑا عرصہ کسی کی شاگردی کرو۔ تم ابھی اناڑی ہو۔ ابھی کچی عمر میں ہو، اور تم دیہاتی ہو ..... اگر کوئی استاد نہیں ملتا تو مجھے اُستاد بنا لو۔ میں تمہیں اپنا بیٹا سمجھ کر ایسے ہاتھ اور ایسے داؤ سکھا دوں گا اور جگہ ایسی بتا دوں گا کہ تم اس علاقے کے بادشاہ بن جاؤ گے۔"

نوجوان رہزن اپنے شکار کے مُنہ کی طرف دیکھتا رہا۔

"تم مجھے قتل نہیں کر سکو گے" ——— بوڑھے شکار نے کہا ——— "اگر قتل کر بھی دو گے تو پکڑے جاؤ گے۔"

"مجھے کوئی نہیں پکڑ سکتا" ——— نوجوان نے تکبّر کے لہجے میں کہا ——— "تمہاری لاش یہیں پڑی رہنے دوں گا اور ..."

"میں نے بھی اپنے شکار کو ایسے ہی کہا تھا" ——— بوڑھے نے کہا ——— "اور اُس کی لاش یہیں پڑی رہنے دی تھی۔ رات کا یہی وقت تھا۔ میں نے کہا تھا مجھے کوئی نہیں پکڑ سکتا لیکن میں اگلی رات حوالات میں بند تھا۔ آج سترہ اٹھارہ برس بعد نکلا ہوں ..... میں بارہ تیرہ برس بعد آجاتا لیکن میں نے جیل خانے میں ایک وارڈر کو زخمی کر دیا تھا۔ میری سزا سے قید پانچ برس بڑھ گئی تھی۔"

"تم نے اُسے کیوں قتل کیا تھا؟" ——— رہزن نے پوچھا۔

"تم مجھے کیوں قتل کرنا چاہتے ہو؟" ——— رہزن کے شکار نے پوچھا۔

"کیوں کہ میں رہزن ہوں۔"

"میں بھی رہزن تھا" ——— شکار نے جواب دیا۔

نوجوان رہزن نے کلہاڑی اپنے اور بوڑھے رہزن کے درمیان رکھ دی اور بوڑھے کے چہرے کو اشتیاق سے دیکھنے لگا۔

"تم تو اُستاد رہزن ہو گئے!"

"پہلے استاد نہیں تھا" ——— بوڑھے نے کہا ——— "جیل خانے میں استاد دل نے بڑے قیمتی گُر سکھا دیتے ہیں۔"

بوڑھے نے اُسے گُر بتانے شروع کر دیتے۔ یہ نوجوان رہزن کے لئے نئے اور دلچسپ تھے۔ بوڑھے کے بولنے کا انداز نوجوان رہزن کو پیارا الگ رہا تھا۔

"لیکن بیٹا!" ـــــ بوڑھے نے کہا ـــــ "تم یہ کام چھوڑ دو ....تمہارا باپ ہے؟"

"مر گیا ہے۔"

"اور ماں؟"

"زندہ ہے" ـــــ نوجوان رہزن نے جواب دیا ـــــ "وہ مجھے اِس کام سے نہیں روکتی" ـــــ اُس نے ذرا دیر خاموش رہ کر کہا ـــــ "میں نے اپنی پہلی واردات کے اُسے پیسے دیتے تھے تو وہ بہت خوش ہوتی تھی۔ میں اُسے خوش رکھنا چاہتا ہوں۔ میں یہ کام نہیں چھوڑوں گا ....تم کہاں جا رہے ہو؟"

"اپنے گاؤں" ـــــ بوڑھے نے جواب دیا۔

"آج رات میرے گاؤں میں نہیں گزارو گے؟" ـــــ نوجوان رہزن نے کہا ـــــ "میں نے تمہیں اُستاد مان لیا ہے۔ چلو میرے ساتھ۔"

اور بوڑھا رہزن جو اٹھارہ برس قید کاٹ کر آ رہا تھا، نوجوان رہزن کے ساتھ اُس کے گاؤں چلا گیا۔ نوجوان رہزن نے اپنے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ ایک عورت نے کھولا۔ اُس کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ اپنے بیٹے کے ساتھ ایک اجنبی کو دیکھ کر وہ ذرا پیچھے ہٹ گئی۔

"یہ میرا مہمان ہے" ـــــ بیٹے نے اپنی ماں سے کہا ـــــ "مہمان نہیں ماں جی! اسے میرا اُستاد سمجھو۔ صبح چلا جائے گا۔"

نوجوان رہزن بولتا رہا اور بوڑھا رہزن چپ چاپ سنتا رہا۔ نوجوان رہزن کی ماں کی عمر پچاس برس سے خاصی کم لگتی تھی۔ اس عمر میں بھی اُس کے چہرے کی دلکشی باقی تھی۔ اُس کی ڈیل ڈول جوان عورتوں کی سی تھی۔ بوڑھا رہزن اُسے دیکھتا تھا تو اُس کی نظریں اس عورت کے ساتھ چپک کے

رہ جاتی تھیں۔ نوجوان رہزن اُس وقت بھی کچھ نہ کچھ بول رہا تھا جب اُس کی ماں نے مہمان کے آگے دودھ کا گلاس اور پراٹھے رکھے تھے۔ ماں نے مہمان کو نظر بھر کے دیکھا تھا۔

ماں نے مہمان اور اپنے بیٹے کی چارپائیاں کمرے میں اور اپنی چارپائی رسوئی میں بچھاتی اور تھوڑی دیر بعد تینوں گہری نیند سو گئے۔

زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ مہمان آہستہ آہستہ چارپائی سے اُٹھا۔ اُس نے کچھ دیر نوجوان رہزن کے خراٹے سُنے۔ جب اُسے یقین ہو گیا کہ وہ جوانی کی گہری نیند سویا ہُوا ہے تو مہمان دبے پاؤں چلتا کمرے سے نکل گیا۔ اُس نے رسوتی کے دروازے پر ہاتھ رکھا تو کواڑ کھُل گیا۔ وہ اندر چلا گیا۔ رسوتی کے کھلے ہوتے دریچے سے چاند جھانک رہا تھا۔ اُس کی روشنی میں نوجوان رہزن کی ماں سوتی ہوتی نظر آرہی تھی۔ مہمان رہزن نے اس عورت کے پاؤں پر ہاتھ رکھ کر ہلایا۔ عورت اُٹھ بیٹھی۔

"میں نے اِسی لئے رسوتی میں اپنی چارپائی بچھاتی تھی کہ تم آؤ گے" ——نوجوان رہزن کی ماں نے کہا—— "آجاؤ"—— اور وہ پرے سرک گئی۔

مہمان پائنتی بیٹھ گیا۔

"تم نے میرے بیٹے کو بھی رہزن بنا دیا ہے!"—— مہمان نے کہا—— "میں جیل خانے میں اٹھارہ برس تیری اور اپنے بیٹے کی صورت دیکھنے کو ترستا رہا ہوں۔ میں تمہیں کہہ گیا تھا کہ بچے کو بتانا کہ تمہارا باپ مر گیا ہے۔ نہ خود مجھے ملنے جیل خانے آنا نہ بچے کو لانا اور اس کی پرورش اس طرح کرنا کہ یہ عزت اور غیرت والا بنے لیکن تم نے اسے بھی رہزن بنا دیا ہے۔ مجھے بھی تم نے رہزن اور ڈکیت بنایا تھا۔ تمہاری محبت نے مجھے اندھا کیا تھا۔ میں جان کی بازی لگا کر تمہارے گاؤں سے تمہیں بھگا لایا تھا اور اپنی برادری اور ساری دنیا کو اپنا دشمن بنا لیا تھا۔ تم نے کہا تھا روپیہ پیدا کرو۔ تم شہزادی بننا چاہتی تھیں .... اور میں نے رہزنی شروع کر دی اور ایک آدمی کو جان سے مار

ڈالا .... میں اپنی قید کاٹ کر خوشی خوشی گھر کو آ رہا تھا کہ میرا بیٹا جوان ہو چکا ہو گا اور وہ باعزت زندگی گزار رہا ہو گا، لیکن تم نے ....“

اُس نے دکھیاری سی آہ لی اور اُٹھ کھڑا ہُوا۔ عورت نے لپک کر اُس کا ہاتھ پکڑنا چاہا لیکن وہ رسوئی سے نکل گیا۔

صبح بیٹا دیر سے اُٹھا اور ماں سے پوچھا کہ مہمان کہاں ہے۔

”وہ چلا گیا ہے“۔۔۔ ماں نے جواب دیا اور مُنہ پھیر لیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ بیٹا اُس کے آنسو دیکھ لے۔

ایک گھڑی ساز جس نے برطانوی بحریہ کی کمر توڑ دی

موجودہ دُور کی جنگ میں کوئی فوج خواہ وہ کتنی ہی طاقتور کیوں نہ ہو، دشمن کے ملک میں دُور دُور تک پھیلے ہوئے مضبوط جاسوسی نظام کے بغیر کوئی نمایاں فتح حاصل نہیں کر سکتی۔ دوسری جنگِ عظیم میں لڑنے والی قوموں کے جاسوسوں نے حیران کُن کارنامے کر دکھائے اور ایک ایک آدمی نے ایسی ایسی تباہی بپا کی جو ٹینک، طیارے اور بحری جنگی جہاز مل کر بھی نہیں کر سکتے۔ یہ کہانی جو ایک جرمن جاسوس کا کارنامہ ہے، پڑھیے اور اپنے گردوپیش کو غور سے دیکھیے۔ بھارت کے جاسوسوں کی ایک فوج پاکستان میں سرگرم ہے۔ یہ بھی یاد رکھیے کہ جاسوس صرف جنگ کے دوران ہی کام نہیں کرتے۔ امن کے زمانے میں بھی اپنے کام میں مصروف رہتے ہیں اور اپنے اپنے فوجی ہیڈکوارٹروں کو دشمن کی دُکھتی رگیں بتاتے رہتے ہیں۔

سکاٹ لینڈ کا ساحل ایک مقام سے ایسا اندر چلا گیا ہے کہ انگریزوں نے وہاں بحری جنگی جہازوں اور آبدوزوں وغیرہ کا اڈہ بنا رکھا تھا۔ اس جگہ کا نام سکاپا ہے۔ اس اڈے یا جنگی بندرگاہ کو مختلف انتظامات سے ناقابلِ تسخیر بنا دیا گیا تھا۔ اس کا مُنہ تنگ تھا جس میں سے دشمن کے کسی بحری جہاز یا آبدوز کا داخلہ ناممکن تھا کیونکہ مُنہ کی تنگی کے علاوہ سمندر میں بارودی سُرنگیں بچھا دی گئی تھیں۔ برطانیہ کی بحری ہائی کمان بجا طور پر فخر کر سکتی تھی کہ دشمن کی چھوٹی سی جنگی کشتی بھی اس بندرگاہ میں داخل نہیں ہو سکتی مگر ہُوا یوں کہ ۱۳، اکتوبر ۱۹۳۹ء کی رات یہ بندرگاہ مہیب دھماکوں سے لرز اُٹھی۔ ایک بڑا جنگی جہاز تباہ ہو کر ڈوب گیا، ایک اور بڑا جنگی جہاز ڈوبا تو نہیں لیکن اسے اتنا شدید نقصان پہنچا کہ لمبے

عرصے تک جنگ میں شریک ہونے کے قابل نہ رہا۔ متعدد چھوٹے جنگی جہاز بھی تباہ ہو گئے یا لمبے عرصے تک کے لئے بیکار ہو گئے اور سب سے بڑا نقصان جو حکومتِ برطانیہ کو ہُوا وہ یہ تھا کہ اس کا یہ زعم ٹوٹ گیا کہ ان کا سکاپا کا بحری اڈہ ناقابلِ تسخیر اور جرمنوں کے ہاتھوں محفوظ ہے۔ جنگ شروع ہوتے ابھی ڈیڑھ مہینہ ہُوا تھا۔

برطانوی افواج کی ہائی کمان کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ برطانیہ کے نظامِ جاسوسی کے ایک خصوصی شعبے کو حرکت میں لایا گیا۔ اس کے سپرد یہ مہم کی گئی کہ یہ تباہی کسی جاسوس کا کارنامہ ہے، اسے تلاش کیا جائے۔ یہ سراغ مل گیا تھا کہ یہ تباہی صرف ایک آبدوز لے مچاتی ہے لیکن جرمنوں کی آبدوز کسی جاسوس کی راہنمائی کے بغیر اندر نہیں آسکتی تھی۔ برطانیہ کا محکمۂ جاسوسی سراغرسانی میں مصروف ہو گیا۔ سراغرسانوں نے یہ کھوج لگا لیا کہ اس اڈے کے قریب گھڑیاں مرمت کرنے والے ایک آدمی کی دکان تھی جو تباہی کی رات کے بعد سے بند ہے۔ گھڑی ساز کا نام البرٹ اورٹل تھا۔ اُس نے یہ دکان ۱۹۲۷ء میں کھولی تھی۔ بارہ سال کے عرصے میں یہ آدمی کبھی غیر حاضر نہیں ہُوا تھا۔ اب اُس کی دکان بند تھی اور وہ خود لاپتہ تھا۔ اس کے گاہک اور اسے جاننے والے لوگ تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھے کہ یہ گھڑی ساز جو بارہ سال سے اُن کے ساتھ پیار اور محبت سے رہ رہا ہے اور جس نے کاروبار میں اور معاشرتی زندگی میں کبھی کسی کا دل نہیں دُکھایا، جاسوس ہو سکتا ہے۔ برطانوی بحریہ کے افسروں تک نے البرٹ اورٹل کے کردار اور چال چلن کی تعریف کی۔ مگر یہ نیک اور شگفتہ مزاج گھڑی ساز ایسا لاپتہ ہُوا کہ آج تک کسی کو نظر نہیں آیا۔ اس کی دکان کھول کر دیکھی گئی۔ وہاں سامان موجود تھا۔ اس کا مکان دیکھا گیا جہاں وہ اکیلا رہتا تھا۔ وہاں بھی سامان قرینے سے رکھا تھا۔

پھر وہ گیا کہاں؟ قتل ہو گیا؟ اغوا ہو گیا؟ —— کوئی سراغ نہ ملا۔ جنگ ختم ہونے کے کچھ عرصہ بعد جب جرمنی کے انٹیلی جنس کے محکمے کے خفیہ کاغذات انگریزوں کے قبضے میں آئے تو معلوم ہُوا کہ سکاپا کی تباہی اسی نیک اور شگفتہ مزاج گھڑی ساز

کی راہنمائی میں ہوتی تھی اور اس کا نام البرٹ اورٹل نہیں بلکہ کیپٹن الفریڈ ویہرنگ تھا اور وہ انگریز نہیں بلکہ جرمن تھا جس نے جنگ شروع ہونے سے بارہ سال پہلے یہاں گھڑیاں مرمت کرنے کی دکان کھولی تھی۔ ان کاغذات اور متعلقہ افسروں سے جو معلومات حاصل ہوتیں وہ جاسوسی کی ایک قابلِ داد کہانی ہے۔

جرمنی نے یہ جاسوس جنگِ عظیم کے دوران سکاٹ لینڈ میں نہیں بھیجا تھا بلکہ جنگ سے بارہ سال پہلے یعنی ۱۹۲۷ء میں ہی بھیج دیا تھا۔ پہلی جنگِ عظیم میں جرمنی نے پوری طرح شکست کھائی تھی جس کا انتقام لینے کے لئے جرمنی نے اُسی وقت جنگی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ یہی جذبہ ہٹلر کو اقتدار میں لایا تھا۔ زندہ رہنے والی باوقار قومیں شکست کھا کر بیٹھ نہیں جایا کرتیں اور نہ ہی شکست کو فیصلہ کُن سمجھتی ہیں جرمنی نے پہلا کام یہ کیا کہ تمام دنیا کے ممالک میں جن میں فرانس، برطانیہ اور امریکہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، اپنے جاسوس بھیج دیتے۔ سکاٹ لینڈ کے سکاپا کی جاسوسی بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ جرمن ہائی کمان نے یہ جگہ دیکھ کر اس کی جنگی اہمیت اور افادیت معلوم کر لی تھی۔ یہ نہایت مستحکم اور وسیع بحری اڈہ بن سکتا تھا۔ جرمن چاہتے تھے کہ جنگ شروع ہوتے ہی اس جگہ پر قبضہ کیا جاتے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو اس اڈے کو اس طرح بیکار اور غیر محفوظ کر دیا جاتے کہ انگریز بھی اسے استعمال نہ کر سکیں۔

انگریزوں نے اس اڈے کے دفاعی نظام کو اس قدر مستحکم کر رکھا تھا کہ وہ فخر سے کہہ سکتے تھے کہ یہ ناقابلِ تسخیر ہے۔ ایک تو قدرت نے ہی اسے محفوظ بنا رکھا تھا۔ اس کا دہانہ تنگ تھا۔ دہانے کے سامنے سمندر میں بارودی سُرنگیں بچھا دی گئی تھیں۔ ان سُرنگوں میں سے اپنے جہاز گذارنے کے لئے تھوڑا سا راستہ محفوظ چھوڑا تھا۔ پانی میں کچھ اور رکاوٹیں بھی تھیں۔ ان میں سے اپنے جہاز گذارنے کے لئے جو راستہ چھوڑا گیا تھا وہ برطانوی بحریہ کے دو چار افسروں کے سوا کسی کو معلوم نہ تھا۔ جو نیا بحری جہاز اس بندرگاہ میں آتا تھا وہ باہر رُک جاتا تھا اور اسے بندرگاہ کے خصوصی کپتان اندر لاتے تھے۔ اس انتظام کے علاوہ بندرگاہ کے خاص خاص مقامات پر دُور مار توپیں نصب کر دی گئی تھیں تاکہ دشمن کا کوئی جہاز رکاوٹوں اور

بارودی سُرنگوں میں سے گذر آتے تو اسے بندرگاہ میں داخل ہونے سے پہلے ہی تباہ کر دیا جاتے۔

جرمن بحریہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ دفاعی انتظامات کیا ہیں اور اگر دہانے کے سامنے بارودی سُرنگیں بچھی ہوتی ہیں تو ان میں سے گذرنے کا راستہ کون سا ہے۔ یہ کام جرمن ہائی کمان نے اپنی بحریہ کے ایک کیپٹن ایلفریڈ ویہرنگ کے سپرد کیا۔ اسے جاسوسی کی خصوصی ٹریننگ دی گئی۔ انگریزی بول چال سکھائی گئی۔ یہ جرمن کپتان ذہین اور دلیر تھا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ جب کبھی جنگ شروع ہو گی سکاٹ لینڈ کے اس اڈے کو تباہ کرنے کا ایک خفیہ مشن بھیجا جائے گا اور کیپٹن ویہرنگ اس مشن کی راہنمائی کرے گا۔

ایک روز ایک آدمی برطانیہ میں داخل ہُوا۔ اس نے اپنا نام البرٹ اورٹل بتایا اور جہاں بھی گیا اسی نام سے اپنا تعارف کرا کے بتایا کہ وہ جنیوا سے آیا ہے اور روزگار کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہے۔ اُس نے اپنا پیشہ گھڑی سازی بتایا۔ جاسوسی کی ٹریننگ میں گھڑی سازی کی ٹریننگ بھی شامل تھی۔ چند دنوں بعد وہ سکاٹ لینڈ کی سکاپا بندرگاہ میں جا پہنچا۔ اس نے ایک بلند جگہ اپنی دکان بنا لی۔ یہ ایسی جگہ تھی جہاں سے نہ صرف بندرگاہ نظر آتی تھی بلکہ وہ توپیں بھی نظر آتی تھیں جو بندرگاہ کے دفاع کے لئے نصب کی گئی تھیں۔ ان میں طیارہ شکن توپیں بھی تھیں۔ یہ سب ڈھکی چھپی تھیں۔ اس جگہ سے بندرگاہ کا دہانہ بھی نظر آتا تھا اور صاف دیکھا جاتا تھا کہ بحری جہاز اس میں سے کس طرح دائیں بائیں گھوم پھر کر گزرتے ہیں۔ اس جگہ کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہاں بحریہ کے ملاح اور افسر رہتے تھے جن سے دوستانہ گانٹھ کر ضروری معلومات حاصل کی جا سکتی تھیں۔

کیپٹن ویہرنگ نے البرٹ اورٹل کے نام سے گھڑی سازی کی دکان کھول لی۔ دکان کی تشہیر کی۔ لوگوں میں اُٹھنے بیٹھنے لگا اور چند دنوں میں نیک، زندہ دل اور شگفتہ مزاج آدمی کی حیثیت سے مقبول ہو گیا۔ اس کے گاہک بندرگاہ پر کام کرنے والے لوگ، ملاح اور بحریہ کے افسر تھے۔ وہ کام تسلی بخش کرتا تھا۔ اُجرت خاصی کم لیتا تھا۔ وعدے کے مطابق کام کرتا تھا۔ سلوک اس قدر

اچھا کہ افسر اسی کے پاس جانا پسند کرتے تھے۔ وہ چونکہ بحریہ کا افسر تھا، سمندری زندگی سے واقف تھا اس لئے وہ بحریہ کے افراد کے ساتھ سمندر کی باتیں کیا کرتا تھا جو اُن کے مزاج کے مطابق تھیں۔ ویہرنگ انہیں جھوٹ موٹ سمندری کہانیاں اور مختلف ممالک میں اپنی عشق بازیوں کے قصے سناتا تھا۔ برطانوی بحریہ کے ملاح اور افسر اسے اپنی کہانیاں سناتے۔ اس طرح اس نے بہت سے افسروں کو دوست بنا لیا۔

دوستی میں بے تکلفی پیدا ہو گئی۔ بے تکلفی رازدارانہ دوستی میں بدل گئی۔ یہ ویہرنگ کے مزاج کی شگفتگی کا کرشمہ تھا۔ اُس نے وہاں کے ذمہ دار لوگوں کے دلوں پر قبضہ کر لیا۔ اس سے اُس نے یہ فائدہ اُٹھایا کہ افسروں کو گپ شپ میں لگا کر اُن سے راز کی باتیں بھی معلوم کر لیتا۔ اسے جو ساحلی توپیں نظر نہیں آتی تھیں ان کی پوزیشنیں بھی وہ جان گیا۔ رات کے وقت وہ نقشہ بناتا اور معلومات ایک ڈائری میں لکھ لیتا۔ کبھی کبھار برلن (جرمنی) سے ایک آدمی کسی بھروپ میں اس کے پاس آتا تو یہ نقشے اور معلومات لے جاتا۔ پھر اس بندرگاہ کے دفاعی انتظامات میں تبدیلیاں ہونے لگیں۔ جونہی کوئی تبدیلی ہوتی اس کی اطلاع برلن پہنچ جاتی۔ اُدھر برلن میں ویہرنگ کی بھیجی ہوتی معلومات میں اضافہ ہوتا گیا اِدھر سکاٹ لینڈ کے سکاپا ساحل پر وہ البرٹ اورٹل کے بھروپ میں مقبول ترین انسان بنتا گیا۔ اُس نے سمندر کے اُس حصے کی نشاندہی بھی کر لی جس میں بارودی سُرنگیں بچھی ہوتی تھیں اور جہاں دیگر رکاوٹیں بھی تھیں۔ ان میں سے گزرنے کا راستہ بھی اُس نے معلوم کر لیا۔

بارہ سال گذر گئے۔ کسی کو شک بھی نہ ہُوا کہ یہ زندہ دل گھڑی ساز جو ہر کسی کا دوست اور بہی خواہ ہے اور اپنا کام دیانتداری اور خلوص سے کرتا ہے اُن کے خون کا پیاسا ہے اور ان کے لئے مجسّم بم ہے۔ یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کے روز جرمنی نے جنگ کی ابتدا کر دی۔ ۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کے روز برطانیہ نے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور سکاپا کے بحری اڈے کے دفاعی انتظامات میں مزید تبدیلیاں کر کے اسے اور زیادہ مستحکم کر دیا۔ ویہرنگ نے اپنی ہائی کمان کو ان

تبدیلیوں سے بھی آگاہ کر دیا اور تازہ نقشہ بھیجا۔ اس کے مطابق جرمنی کو بھی اپنے منصوبے میں ردوبدل کرنا پڑا۔ اشارے مقرر کر دیتے گئے اور سکاپا کو تباہ کرنے کا مشن بحریہ کے ایک افسر کیپٹن پرین کے سپرد کیا گیا۔ اسے ایک آبدوز سے حملہ کرنا تھا۔

۱۲ اکتوبر کی رات کیپٹن پرین آبدوز "۴۷۔ U" لے کے سطح سمندر سے نیچے سکاٹ لینڈ کی طرف روانہ ہوا اور رات ساڑھے گیارہ بجے آبدوز سکاپا بندرگاہ کے قریب پہنچ کر رُک گئی۔ اب اسے ساحل سے اشارے کا انتظار تھا۔ آبدوز سطح آب پر اُبھر آئی تھی۔ اس کا رنگ سیاہ تھا اور رات بھی تاریک تھی اس لئے یہ نظر نہیں آسکتی تھی۔ ساحل سے ایک بتی جل کر بجھ گئی۔ یہ ویہرنگ کا اشارہ تھا۔ کیپٹن پرین نے فوراً آبدوز کو ڈبکی میں ڈال دیا اور پانی کے اندر لے گیا۔ اسے بتا دیا گیا تھا کہ کس سمت سے بندرگاہ کے دہانے میں داخل ہونا ہے۔ یہ بارودی سرنگوں میں سے محفوظ راستہ تھا۔ آبدوز اس راستے سے گزر کر بندرگاہ میں داخل ہو گئی۔ سکاٹ لینڈ کے لوگ گہری نیند سوتے ہوتے تھے۔ اچانک رات دل دہلا دینے والے دھماکوں سے لرز اُٹھی۔ اس سے پہلے روشنی کا اشارہ ملتے ہی آبدوز میں سے ربڑ کی ایک کشتی ساحل کے ایک خاص حصے کی طرف روانہ کر دی گئی تھی۔

صرف بارہ منٹ کے عرصے میں کیپٹن پرین نے بندرگاہ میں دو بڑے جنگی جہاز تباہ کر دیتے اور باقی متعدد جنگی جہازوں کو شدید نقصان پہنچایا۔ برطانیہ والے خوش قسمت ہیں کہ ان کی بحریہ ایک عظیم نقصان سے بچ گئی۔ تین چار دن پہلے اس بندرگاہ میں برطانوی نیوی کا تقریباً پورا بیڑہ لنگر انداز تھا۔ اسے وہاں سے نکال لیا گیا تھا ورنہ ایک آبدوز پورے بیڑے کو تباہ کر جاتی۔ یہ آبدوز تباہی مچا کر بندرگاہ سے نکل آتی اور محفوظ جگہ جا کر رُک گئی۔ اس سے جو ربڑ کی کشتی بھیجی گئی تھی وہ ساحل پر گئی۔ کیپٹن ویہرنگ، سکاپا کا معصوم گھڑی ساز، اس کشتی میں بیٹھا اور کشتی اسے آبدوز تک لے گئی اور آبدوز اسے جرمنی لے گئی۔ سکاٹ لینڈ والے ایک دوسرے سے پوچھتے رہے کہ البرٹ گھڑی ساز جانے کہاں غائب ہو گیا ہے۔ وہ اسے یاد کرتے رہے کیونکہ وہ ان کا دوست تھا۔

میرا دل نکالو، میرا دل کھالو

اس کہانی کے راوی محترم سعید الدین وسطی ہندوستان میں پولیس میں ہیڈ کانسٹیبل ہوا کرتے تھے۔ ۱۹۴۸ء میں ہجرت کر کے پاکستان آ گئے تھے۔ چند سال بعد پولیس سے ریٹائر ہو گئے اور اب بڑھاپا فراغت سے گزار رہے ہیں۔ عمر پولیس میں گزارنے کی وجہ سے جرائم اور سراغرسانی میں بہت دلچسپی لیتے ہیں۔ میں نے انہیں "حکایت" میں شائع ہونے والے دنیا کے "عجیب و غریب جرائم" کے سلسلے کی اور جناب احمد یار خان کی کہانیاں پڑھنے کو دیں تو انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ ایسی بے شمار سچی وارداتیں سنا سکتے ہیں جو اُن کی سروس کے دوران ہوئیں۔ اُنہوں نے کہا کہ بعض جرائم اتنے حیران کُن ہوتے ہیں کہ خود پولیس کو یقین نہیں آتا کہ کسی انسان نے یہ جرم کیا ہے۔ اُنہوں نے ایک کہانی سنائی جو میں اُن کی زبان میں پیش کرتا ہوں۔

قیصر آباد ایک معمولی سا قصبہ تھا۔ تھانے کا انچارج اسد جیمز نام کا ایک عیسائی تھا۔ بڑا سخت مزاج اور ظالم تھانیدار تھا۔ موقع محل دیکھ کر رشوت لے لیا کرتا تھا، لیکن کوئی واردات خطرے والی ہو تو بہت سختی کرتا تھا۔ ڈیوٹی کا پکا تھا۔ میں اُس کے ساتھ ہیڈ کانسٹیبل تھا۔ ایک روز قیصر آباد کے ایک قریبی گاؤں سے یہ رپورٹ آئی کہ ایک روز پہلے ایک دودھ پیتا بچہ، عمر تین ماہ، مر گیا تھا۔ یہ مسلمانوں کا بچہ تھا۔ شام کو اُسے دفن کر دیا گیا تھا۔ بچے کی ماں دوسرے دن صبح سویرے اپنے بچے کی قبر پر گئی۔ اُس نے دیکھا کہ قبر کی شکل بُری طرح بگڑی ہوتی ہے۔ مٹی اندر کو دھنسی ہوتی تھی۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ قبر کھودی گئی ہے اور اسے جلدی جلدی

سے بھر بھرا گیا ہے۔

ماں گھر دوڑی گئی۔ گھر والوں کو بتایا۔ گھر والے قبرستان گئے۔ گاؤں کے چند اور آدمی بھی ساتھ چلے گئے۔ مختلف آدمیوں نے مختلف رائیں دیں۔ یہ کسی درندے کا کام نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ قبر بھری ہوئی تھی۔ آپس میں مشورہ کر کے انہوں نے قبر کھودی۔ دیکھا کہ مٹی لحد کے اندر بھی گئی ہوئی تھی۔ بچے کی لاش مٹی میں دبی ہوئی تھی۔ لاش باہر نکالی تو یہ دیکھا گیا کہ کفن جو لاش کے ساتھ ہی تھا کھلا ہوا تھا اور عجیب چیز یہ دیکھی گئی کہ بچے کی نیچے والی آخری پسلی سے پیٹ پھٹا ہوا تھا۔ چاقو یا چھری سے چیرا گیا تھا۔ یہ کسی انسان کا کام تھا۔

لاش وہیں قبر کے قریب پڑی رہنے دی گئی اور بچے کا باپ دو تین آدمیوں کے ساتھ تھانے آ گیا۔

سب انسپکٹر جیمز مجھے ساتھ لے کر قبرستان میں گیا۔ پولیس والے لاشوں سے نہیں ڈرا کرتے۔ میں نے اس سے زیادہ بری حالت میں لاشیں دیکھی ہیں لیکن تین ماہ کے معصوم بچے کی لاش کا پیٹ چاک کیا ہوا دیکھا تو میرے دل پر عجیب سا بوجھ پڑ گیا۔ بچہ ایک ہی دن پہلے مرا تھا۔ اس کا کلی جیسا چہرہ اتنا پیارا تھا جیسے مرا ہوا نہیں سویا ہوا ہو۔ حیرت اس پر تھی کہ لاش کو قبر سے نکال کر کس نے چیرا پھاڑا ہے۔ یہ شک پیدا ہوا کہ بچے کو قتل کر کے دفنایا گیا ہو گا۔ اس کی یہ وجہ ہو سکتی تھی کہ خاوند کو شک ہو گا کہ یہ بچہ اس کا نہیں۔ یہ شک جیمز نے قبرستان میں رفع کر لیا۔ بہت سے لوگوں نے بتایا کہ بچہ بخار سے مرا ہے۔

لاش پوسٹ مارٹم کے لئے بھجوائی گئی۔ پتہ چلا کہ بچے کا دل غائب ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ کسی نے قبر کھود کر بچے کی لاش نکالی اور پسلیوں کے نیچے سے سینہ چاک کر کے دل نکالا ہے۔ پھر اس نے لاش لحد میں رکھ کر اینٹیں نہیں رکھیں، قبر مٹی سے بھر دی۔ سب انسپکٹر جیمز نے یہ فیصلہ دیا کہ کسی نے کوئی ٹونہ کیا ہے۔

آپ ہندوؤں کی توہم پرستی اور ٹونے وغیرہ سے واقف نہیں ہوں گے ہندوؤں کے اکثریتی علاقوں میں رہنے والے مسلمانوں نے بھی ان کی کئی بیہودہ رسمیں اور ٹونے ٹوٹکے وغیرہ اپنا لئے تھے۔ مجھے بھی یہی شک تھا جو جیمز نے ظاہر کیا تھا۔

بے اولاد عورتیں کئی ایک ٹونے کیا کرتی تھیں جن میں ایک یہ تھا کہ ایک خاص قسم کے مرے ہوئے سانپ کے اوپر ٹوکرا رکھ کر عورت ٹوکرے پر بیٹھ کر نہایا کرتی تھی۔ انسانی کھوپڑیوں کے ٹکڑے بھی دواتی میں استعمال ہوتے تھے۔ یہ ٹکڑے حاجت مند عورت کو خود قبرستان سے لانے پڑتے تھے۔ ایک ٹونہ یہ بھی تھا کہ دودھ پیتے بچے کی لاش پر ٹوکرا رکھ کر بے اولاد عورت کو ٹوکرے پر بیٹھ کر نہانے کو کہا جاتا تھا۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس مقصد کے لئے کوئی بھی اپنے مرے ہوئے بچے کی لاش نہیں دیتا۔

اس حد تک خطرناک ٹونہ بھی بتایا جاتا تھا کہ بے اولاد عورت کسی کے نوزائیدہ بچے کو اپنے ہاتھوں قتل کرے اور اس کا خون پیئے۔ پسماندہ اور جنگلی لوگ اس قسم کے بھیانک ٹونے کر گزرتے تھے۔ ہندوؤں میں یہ خوفناک ٹونے زیادہ چلتے تھے لیکن مسلمانوں نے بھی ان پر عمل شروع کر دیا تھا۔ مسلمان چونکہ دلیر ہوتے ہیں اس لئے وہ لاشوں کی بے حرمتی بھی کر دیا کرتے تھے۔ میری سروس میں تین وارداتیں ہوئی تھیں جو الگ الگ کہانیاں ہیں۔ اب ایک بچے کی مدفون لاش کا دل نکال لیا گیا تو یہی سمجھا گیا کہ یہ کسی بے اولاد عورت کا کام ہے لیکن عورت کتنی ہی دلیر کیوں نہ ہو وہ کسی بچے کا دل نہیں نکال سکتی۔ لاش رات کے دوران نکالی گئی تھی۔ آپ جانتے ہیں کہ رات کے وقت قبرستان میں جانے سے لوگ ڈرتے ہیں، مگر اس واردات میں تو لاش نکالی گئی اور اس کی چیر پھاڑ کی گئی تھی۔ لہٰذا یہ کام کسی دلیر آدمی کا تھا۔

ہمیں معلوم تھا کہ سنیاسی اور سادھو وغیرہ جو اکثر خانہ بدوش رہتے تھے قبرستانوں سے انسانی ہڈیاں اٹھا لے جایا کرتے تھے۔ یہ سنیاسی وغیرہ عموماً ویرانوں میں غاروں اور گپھوں میں رہتے تھے۔ حاجت مند اُن کے پاس پہنچ جاتے تھے۔ ان کا تعلق صرف ہندو مذہب کے ساتھ ہوتا تھا۔ ہندو عورتیں خصوصاً بے اولاد ہندو عورتیں ان کی بہت ٹہل سیوا کرتی تھیں اور بے حیائی کی حد تک انہیں خوش رکھتی تھیں۔ افسوسناک بات یہ دیکھنے اور سننے میں آتی کہ بعض مسلمان بھی ان کے معتقد ہو جاتے تھے۔

سب انسپکٹر جیمز نے رپورٹ (ایف. آئی. آر) لکھ کر مخبروں کو دو کام دیئے۔ ایک یہ کہ متعلقہ گاؤں میں اُس بے اولاد عورت کو تلاش کریں جو اولاد کے لئے پریشان ہو اور ٹوٹنے اور تعویذ وغیرہ کر رہی ہو۔ دوسرا کام یہ کہ تمام علاقے میں گھومیں پھریں۔ اگر کہیں سنیاسی یا سادھو ڈیرے ڈالے ہوتے ہوں تو فوراً اطلاع دیں۔ گاؤں چھوٹا نہیں تھا لیکن یہ گاؤں ہی تھا۔ کسی کے گھر کے حالات کسی سے چھپے ہوتے نہیں تھے۔ ایک ہی دن میں ایک بے اولاد عورت کے متعلق پتہ چل گیا کہ اُس نے نہ کوئی خانقاہ چھوڑی ہے نہ کوئی پیر فقیر چھوڑا ہے اور وہ سنیاسیوں، سادھوؤں اور پنڈتوں کے پاس بھی جاتی رہی تھی۔

اُس کے متعلق، اُس کے خاوند کے متعلق اور اُس کے خاندان کے سب افراد کے متعلق رپورٹیں لی گئیں۔ کسی رپورٹ سے یہ شک نہیں ہوتا تھا کہ اس خاندان کا کوئی فرد یا عورت اس قسم کا بھیانک جُرم کر سکتی ہے۔ جیمز نے گہری چھان بین کی لیکن یہ عورت بے گناہ نکلی۔ مجرم یا مجرمہ کسی دوسرے گاؤں کی بھی ہو سکتی تھی۔ مخبروں سے کہا گیا کہ وہ ارد گرد کے چھوٹے بڑے گاؤوں میں بے اولاد عورتوں کو تلاش کریں۔ مسلمانوں کے عامل اور پیر بھی تھے۔ ہمارے علاقے میں ان کی تعداد آٹھ یا نو تھی۔ ان پر بھی نظر رکھی گئی۔ مخبروں سے کہا گیا کہ وہ ان کے پاس یہ "مراد" لے کے جائیں کہ اُن کے اولاد نہیں ہوتی، کوئی تعویذ دیں یا کوئی ٹونہ بتائیں۔

ایک مخبر اطلاع لایا کہ متعلقہ گاؤں سے کوئی ایک میل دُور کھڈ نالوں، چٹانوں اور ٹیلوں کا علاقہ ہے۔ وہاں ایک ٹیلے میں قدرتی غار ہے۔ اس میں پانچ سادھو ڈیرہ ڈالے ہوتے ہیں۔ یہ خانہ بدوش سادھو سارے جسم پر راکھ مل کر رکھتے تھے۔ اکثر ننگے بھی رہتے تھے۔ سر پر انہوں نے موٹے موٹے مصنوعی بال چپکاتے ہوتے تھے۔ یہ لوگ جڑی بوٹیوں کی دوائیاں بھی بناتے تھے۔ بہرحال یہ عجیب مخلوق تھی جو ہندوستان میں اب بھی اُسی طرح موجود ہے جس طرح میرے زمانے میں ہوتی تھی۔

جیمز نے ان پانچ سادھوؤں پر شک کیا لیکن اُن پر چھاپہ مارنے کی بجائے اُن کے پاس ایک مخبر عورت کو بھیجنے کا ارادہ کیا۔ ہمارے ہاتھ میں ایک جوان اور بڑی اچھی شکل وصورت والی مخبر عورت تھی۔ وہ ایک غریب سے مسلمان کسان کی بیوی تھی۔ اُس کا خاوند بھی اپنی بیوی کی طرح بہت چالاک اور ہوشیار آدمی تھا۔ ان کے دو یا غالباً تین بچے تھے۔ اس عورت کو تھانے بلا کر سب انسپکٹر جیمز نے یہ کام دیا کہ وہ سادھوؤں کے پاس بے اولاد عورت بن کر جائے اور اُن پر یہ ظاہر کرے کہ وہ امیر عورت ہے اور اولاد کی خاطر وہ مُنہ مانگا انعام دے سکتی ہے۔ اُسے بتایا گیا کہ وہ اُن سے ٹونے ٹوٹکے معلوم کرے۔ اگر وہ خود ہی تازہ مرے ہوئے دودھ پیتے بچے کا دل نکال کر کسی طرح استعمال کرنے کا ٹونہ بتائیں تو ٹھیک ہے۔ اگر نہ بتائیں تو اُن سے کہے کہ اُس نے سنا ہے کہ دودھ پیتے بچے کا دل کسی ٹونے میں استعمال ہوتا ہے۔

اس عورت کو واردات کا علم تھا۔ اپنے کام کی وہ استاد تھی۔ اُسے زیادہ سمجھانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ چلی گئی۔ اُسی شام کو جب شام اندھیری ہو چکی تھی وہ تھانے میں آئی۔ میں تو اُسے پہچان نہیں سکا۔ اُس نے ریشمی کپڑے پہن رکھے تھے۔ مُنہ دُھلا دھلایا تھا اور چمک رہا تھا۔ وہ کسی آسودہ حال گھر کی عورت معلوم ہوتی تھی۔ اُس کا عام حلیہ ایک غریب کسان کی بیوی جیسا ہوتا تھا جس سے آپ اچھی طرح واقف ہیں۔ اُس کے جسم سے گوبر اور مٹی کی بدبو آیا کرتی تھی، لیکن اُس شام کو وہ پہچانی نہیں جا رہی تھی۔ جیمز کے کہنے پر عمل کرتے ہوئے وہ سادھوؤں کے پاس امیر عورت بن کر گئی تھی۔ اتفاق سے اُس کی شکل وصورت اچھی تھی اور جوان بھی تھی، اس لئے اس قیمتی لباس میں وہ غریب اور کسان لگتی ہی نہیں تھی۔

جیمز اُسے اندر لے گیا۔ میں ہیڈ کانسٹیبل تھا۔ مجھے ایسا رتبہ حاصل نہیں تھا کہ مجھے دفتر میں بٹھا کر ایس۔ ایچ۔ او اس عورت سے رپورٹ لیتا۔ بعد میں مجھے اتنا ہی پتہ چلا تھا کہ وہ سادھوؤں کے پاس گئی تھی۔ اُس نے اُن کے آگے

رونے کی اداکاری بھی کی تھی اور اُس نے سادھوؤں پر اعتبار جما لیا تھا۔ وہ دوسرے دن بھی سادھوؤں کے پاس گئی اور شام کو اُس نے تھانے میں آکر رپورٹ دی۔ سادھوؤں نے اُسے کوئی ٹوٹنہ بتایا تھا۔ ابھی مرے ہوئے بچے کے دل کا راز سامنے نہیں آیا تھا۔ اُسے اگلے روز بھی جانا تھا۔ وہ شام کو تھانے میں نہ آئی۔ جیمز اُس کا انتظار کرتا رہا۔ وہ نہ آئی تو ہم سمجھے کہ وہ پیدل چلتے تھک گئی ہو گی، گھر جا کر سو گئی ہو گی۔ صبح آجائے گی۔

صبح اُس کی بجائے اُس کا خاوند آیا۔ اُسے دیکھتے ہی جیمز نے اُس نے اُس سے پوچھا ـــــ "تم آگئے ہو، تمہاری بیگم صاحبہ کیوں نہیں آئیں؟"

خاوند کے چہرے پر گھبراہٹ اور حیرت آگئی۔ اُس نے کہا ـــــ "میں تو اُسے یہاں دیکھنے آیا تھا۔ کیا وہ یہاں نہیں ہے؟"

جیمز نے اُسے بتایا کہ وہ تھانے میں نہیں آئی۔ خاوند نے بتایا کہ وہ گذشتہ شام اُسے یہ بتا کر گھر سے نکلی تھی کہ سادھوؤں نے اُسے اس وقت آنے کو کہا ہے جب سورج اندر باہر ہو۔ وہ گھر واپس نہیں آئی۔ وہ تھانے میں بھی نہیں آئی تھی وہ بچی تو نہیں تھی کہ راستہ بھول گئی ہو۔ وہ یقیناً اغوا ہو گئی تھی۔ وہ اس قابل تھی کہ اُسے کوئی اغوا کر کے کہیں دُور لے جا کر فروخت کر دیتا۔ جیمز دانش مند آدمی تھا۔ اُس نے یہ شک ظاہر کیا کہ سادھوؤں کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ یہ عورت مُخبر ہے اور بچے کے دل کی سراغرسانی کے لئے اُن کے غار میں آتی ہے۔ اس قسم کے سادھوؤں میں جرائم پیشہ آدمی بھی ہوا کرتے تھے۔ جیمز نے کہا کہ یہ عورت سادھوؤں کے ساتھ دل کے ٹُونے کی بات کر بیٹھی ہو گی۔ اس نے انہیں اس پر شک ہُوا ہو گا۔

جیمز نے اُسی وقت سادھوؤں پر چھاپہ مارنے کا انتظام کر لیا۔ آگے آگے دیہاتی لباس میں مخبر بھیجے تاکہ وہ سادھوؤں پر نظر رکھیں اور اگر وہ چھاپے سے پہلے ہی بھاگنے کی کوشش کریں تو انہیں پکڑ لیں۔ وہ علاقہ ایسا تھا کہ دُور سے نظر نہیں آسکتا تھا کہ پولیس آرہی ہے۔ چھاپہ مارا گیا۔ میں بھی ساتھ تھا۔ تمام سادھو غار میں موجود تھے۔ جیمز نے انہیں غار سے باہر نکال دیا۔ یہ غار اُونچا

تھا۔ چونکہ یہ مٹی کے ٹیلے میں تھا اس لئے اسے اندر سے کھود کر کچھ وسیع اور اتنا بلند کر دیا گیا تھا کہ اچھے قد کا آدمی اندر کھڑا ہو سکتا تھا۔ اس کے پیچھے ایک اور غار تھا۔ ہم نے اُن کے سامان کی تلاشی لی۔ مرے ہوتے سانپ اور بچھو بھی برآمد ہوتے۔ پچھلے غار میں گئے۔ ہمیں کوئی مشکوک چیز نہ ملی۔

سادھوؤں کا جو مہاسادھو یا مہنت تھا وہ جیمز کو اپنی مخصوص زبان اور مخصوص انداز سے خوفزدہ کرنے کی کوشش کرنے لگا، لیکن جیمز عیسائی تھا۔ وہ اُن کے جنتر منتر اور پھونکوں سے نہ ڈرا۔ اگر جیمز ہندو ہوتا تو ان سادھوؤں کا اتنا احترام کرتا کہ اُن پر ہاتھ ہی نہ ڈالتا۔ اور اگر وہ مسلمان ہوتا تو اس ڈر سے سادھوؤں پر چھاپہ نہ مارتا کہ ہندو اسے اپنے مذہب کی توہین کا مسئلہ بنا لیں گے۔ جیمز نے اپنی عادت کے مطابق کوئی پرواہ نہ کی۔ اُس نے مہاسادھو کو الگ کر لیا اور کہا ——"تمہارے پاس تین دنوں سے ایک عورت آرہی ہے۔ وہ کہاں ہے؟"

"ہمارے پاس ہر روز عورتیں آتی ہیں"—— سادھو نے جواب دیا ——"اور اتنی زیادہ آتی ہیں کہ میں کسی کو چہرے سے پہچان نہیں سکتا کہ یہ بھی یہاں آتی ہے"—— اُس نے ایسے بے نیاز اور بے پرواہ سے انداز سے باتیں کیں جیسے اُسے عورتوں کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں۔

جیمز نے اُسے مخبر عورت کا حلیہ بتا کر پوچھا ——"وہ کل شام یہاں آتی تھی۔ ہمیں بتا دو کہ اُسے کہاں غائب کر دیا ہے تو میں معاملہ یہیں ختم کر دوں گا۔ اگر تھانے میں چل کر بتاؤ گے تو اغوا اور جبری آبرو ریزی کے جرم میں دس سال کے لئے جیل بھجوا دوں گا۔"

مہاسادھو نے پھر بھی انکار کیا۔

جیمز نے تھانیداروں کی طرح کہا ——"سب کو تھانے لے چلو۔"

غار کے پہرے پر دو کانسٹیبل کھڑے کر کے ہم سادھوؤں کو تھانے لے گئے۔ وہاں بڑے سادھو کو یاد آگیا۔ اُس نے کہا ——"یہ عورت شام کو آتی تھی۔ اُسے یہ عمل بتایا تھا کہ آدھی رات کے وقت دریا میں اُس جگہ کھڑی ہو جاتے

جہاں پانی دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے اور درمیان میں خشکی ہوتی ہے۔ اُسے پڑھنے کے لئے کچھ بتایا تھا۔ وہ سورج غروب ہونے کے بعد چلی گئی تھی۔"

"اُس سے تم نے کوئی رقم لی تھی؟"— جیمز نے پوچھا۔

"صرف بیس روپے"— سادھو نے جواب دیا —"اُس نے وعدہ کیا تھا کہ مراد پوری ہو گئی تو ایک ہزار روپیہ دوں گی۔"

اِس دوران اسسٹنٹ سب انسپکٹر بشمبر داس ایک اور سادھو کو الگ لے گیا تھا، اور ایک کو میرے حوالے کر دیا گیا تھا۔ ہم دونوں نے اُن سے اگلوانے کی کوشش کی مگر دونوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ بشمبر داس میرے پاس آیا اور پوچھا کہ تمہارے سادھو نے کچھ بتایا ہے یا نہیں۔ میں نے اُسے جواب دیا کہ یہ مجھے چکر دے رہا ہے۔ بشمبر داس نے کہا کہ اسے لے آؤ۔ ہم پہلے ایک کو اندر لے گئے اور پولیس کا پہلا ہی ہاتھ دکھایا تو اُس کی زبان کھل گئی۔ وہ تشدد کا پہلا وار ہی برداشت نہ کر سکا۔ اُس نے پہلی بات یہ بتائی کہ وہ اصلی سادھو نہیں ہے۔ پھر اُس نے یہ بھی بتا دیا کہ ان پانچوں میں کوئی ایک بھی سادھو اصلی نہیں۔ سب نوسر باز اور فریب کار ہیں۔

ہمارے لئے یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی کہ یہ سب فراڈیئے تھے۔ جس طرح ہمارے ملک میں جعلی پیر ہوتے ہیں اسی طرح ان سنیاسیوں اور سادھوؤں میں جرائم پیشہ لوگ بھی ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اصلی سادھوؤں جیسی اداکاری کرتے اور انہی کی طرح باتیں کرنے کے ماہر ہوتے تھے۔ یہ ہندوؤں کو اسی طرح لوٹتے تھے جس طرح جعلی پیر مسلمانوں کو لوٹا کرتے ہیں۔ بشمبر داس نے دوسرے سادھو کو بلایا۔ اُس نے بھی پہلے حیل وحجت کی لیکن پہلے سادھو کے کہنے پر مان گیا۔ یہ پانچوں مسلمان تھے۔ ان کا سرغنہ جو مہا سادھو بنا ہُوا تھا جیمز کے سامنے ڈٹا ہُوا تھا۔ پکّا ڈھیٹ معلوم ہوتا تھا۔

میں اور بشمبر داس، جیمز کے پاس گئے تو بشمبر داس نے اس سادھو سے کہا —"اب جانے دو استاد! تمہارے شاگرد مان گئے ہیں۔ ہم تمہیں اس جرم میں نہیں پکڑیں گے کہ تم نوسر بازی کر رہے ہو۔ ہمیں تمہارے خلاف کوئی

رپورٹ نہیں ملی۔ صرف یہ بتا دو کہ وہ عورت کہاں ہے؟"

بشمبر داس نے جب جیمز کو بتایا کہ اس کے دوسرے ساتھیوں نے کیا بیان دیا ہے تو جیمز غصّے سے اُٹھا اور لپک کر مہاسادھو کے بال مٹھی میں پکڑ لئے۔ بال مروڑ کر اُسے اُٹھایا اور بڑی زور سے اُسے فرش پر پٹخ دیا۔ وہ پیٹھ کے بل گرا تھا۔ جیمز اُس کے پیٹ پر کھڑا ہو گیا۔ مہاسادھو بلبلا اٹھا اور چلّانے لگا ۔"وہ ٹھیک کہتے ہیں۔ میں سادھو نہیں ہوں"۔

اُس نے بتایا کہ یہ عورت اُن کے غار میں جاتی رہی ہے۔ گمشدگی کی شام بھی آئی تھی پھر چلی گئی تھی۔ سادھو نے کوئی نئی بات نہ بتائی۔ اُس نے یہ بھی بتا دیا کہ اس عورت پر اُس کی نیت خراب تھی لیکن عورت اتنی چالاک تھی کہ آسانی سے ہاتھ آنے والی نہیں تھی۔ جیمز نے اِس پر بہت جرح کی۔ تشدّد سے ڈرایا دھمکایا بھی مگر وہ اسی بیان پر قائم رہا جو وہ دے چکا تھا۔ پانچ چھ گھنٹے اسی ایک آدمی پر صرف ہو گئے۔ دوسرے سادھوؤں سے الگ الگ تحقیقات کی گئی۔ انہوں نے بھی کوئی فالتو بات نہ بتائی۔ وہ اپنے جرائم کی پوری پوری بات سناتے رہے۔ مثلاً انہوں نے گن کر وہ ہندو عورتیں بتائیں جنہیں انہوں نے خراب کیا تھا۔ انہوں نے جو رقم بٹوری تھی وہ بھی بتائی۔ کچھ اور بدمعاشیاں بھی بتائیں۔ ہماری مخبر عورت کے متعلق اُنہوں نے یہی بتایا کہ اس سے بھی رقم بٹورنا اور اُسے خراب کرنا چاہتے تھے۔ اغوا یا قتل اُن کے جرائم میں شامل نہیں تھا۔ ان کے سرغنہ نے کہا کہ اُن کے پاس بڑی خوبصورت لڑکیاں آتی رہی ہیں۔ ان میں سے ایک دو کو آسانی سے غائب کر کے آگے چلایا جا سکتا تھا۔ قیمت بھی اچھی ملتی۔ یہ عورت اتنی قیمتی نہیں تھی۔

رات کو یہ یقین ہونے لگا کہ ان مجرموں نے عورت کو غائب نہیں کیا لیکن انہیں جانے نہ دیا گیا۔ اب یہ شک ہونے لگا کہ ہماری عورت شام کے بعد سادھوؤں کے غار سے نکلی اور راستے میں کسی رہزن یا بردہ فروش کے ہاتھ چڑھ گئی۔ ہمارے لئے ایک واردات کے ساتھ ایک اور واردات آگئی۔ اِن سے پوچھا گیا کہ وہ کس راستے سے واپس گئی تھی۔ پانچوں سادھو اتنے ڈرے

ہوتے تھے کہ بات کرتے اُن کی زبانیں کانپتی تھیں۔ اِن میں سے ایک سادھو نے وہ سمت بتائی جدھر وہ گئی تھی۔ جیمز نے اُسے سوالوں کے جال میں پھنسا کر ایک کارآمد سراغ حاصل کر لیا۔ وہ یہ تھا کہ اس سادھو نے بتایا کہ عورت جب غار سے نکلی تو وہ باہر کھڑا تھا۔ اُس نے عورت کو اپنی نوسر بازی کے جال میں اچھی طرح پھانسنے کے لئے اُسے بتانا شروع کر دیا کہ اُن کا مہاسادھو معجزے کر سکتا ہے اور یہ بھی کہ یہ سادھو جو بھی فرمائش کرے عورت پوری کر دے۔ اس سادھو نے یہ نئی بات بتائی کہ وہ پندرہ بیس قدم اُس کے ساتھ گیا پھر رُک گیا۔ عورت چلی گئی۔

سادھو کو کچھ دُور آگے کسی مرد کی آواز سنائی دی۔ ویرانے میں اور رات کی خاموشی میں آواز بڑی صاف تھی۔ کسی آدمی نے کہا — "ادتے۔ تم ادھر کیا لینے آئی تھیں؟"

عورت نے ہنس کر کہا — "تم کدھر جا رہے ہو؟"

آدمی نے کہا — "اری نیک بخت، اکیلی جاؤ گی؟ چلو، میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔"

دونوں کے ہنسنے کی آوازیں سنائی دیں۔ سادھو اندھیرے میں دیکھ نہ سکا کہ وہ آدمی کون تھا۔ سادھو نے پہلے یہ بات نہیں بتائی تھی۔ اُس نے وجہ یہ بتائی کہ وہ پولیس سے ڈرتا تھا۔ سب انسپکٹر جیمز نے یہ شک بتایا کہ یہ آدمی اُس کا خاوند ہوگا۔ اُس نے عورت کو بدکاری کے شک میں قتل کر دیا ہوگا۔ اگر خاوند نہیں تھا تو کوئی ایسا آدمی ہوگا جسے یہ عورت اچھی طرح جانتی ہوگی۔ اُس وقت اُس کا خاوند تھانے میں موجود تھا۔ اُس سے پوچھا گیا کہ وہ رات گھر سے کہیں باہر گیا تھا؟ اُس نے جواب دیا کہ وہ اپنے دو چھوٹے چھوٹے بچوں کو گھر میں اکیلا چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا تھا۔ اُس سے یہ بھی پوچھا گیا کہ گاؤں میں کون ایسا آدمی ہے جس کی اس کی بیوی کے ساتھ زیادہ بے تکلفی تھی۔ خاوند نے پانچ چھ نام بتائے۔

یہ مسئلہ تو الگ رہ گیا تھا کہ مرے ہوئے بچے کے سینے سے دل کس

نے نکالا تھا، اس عورت کے اغوا کا مسئلہ پریشان کرنے لگا۔ جیمز نے دو کھوجیوں کو بلایا اور انہیں اُس جگہ لے گیا جہاں سادھو کے بیان کے مطابق عورت کو وہ آدمی ملا تھا۔ امید تھی کہ زمین کچھ راہنمائی کرے گی۔ میں بھی ساتھ تھا۔ سادھو بھی ساتھ تھا۔ اُس نے ہمیں اُس جگہ کھڑا کیا جہاں تک وہ مخبر عورت کے ساتھ گیا تھا۔

وہاں سے اُس نے وہ سمت بتائی جدھر سے اُسے آوازیں سنائی دی تھیں۔ ہم اُدھر گئے تو ایک جگہ دو کھُرے (پاؤں کے نشان) صاف دکھائی دیتے۔ کھوجی نے بتایا کہ عورت ایک آدمی کے ساتھ کھڑی ہے۔ دوسرے کھوجی نے ادھر اُدھر گھوم پھر کر کچھ کھُرے تلاش کر لئے اور کہا کہ آدمی اس طرف سے آیا ہے۔ پھر آدمی اور عورت ایک طرف چل پڑے مگر آگے زمین دھوکہ دے گئی۔ آگے ریتوں والی زمین تھی، کچی مٹی نہیں تھی۔ چالیس پچاس قدم آگے گئے تو زمین کچی آگئی۔ کھُرے پھر مل گئے۔

تقریباً ایک سو گز تک یہ پتہ چلتا رہا کہ وہ دونوں اِدھر ہی کو جا رہے ہیں۔ آگے پھر زمین پتھریلی آگئی۔ کوئی دو فرلانگ دُور گدھ زمین پر اُتر رہے تھے۔ جیمز شک کی بنا پر اُدھر چل پڑا۔ ڈیڑھ ایک سو گز فاصلہ طے کیا تو اُدھر سے ایک کتا دوڑتا آیا۔ ہمارے قریب آکر اُس نے راستہ بدلا۔ اُس کے مُنہ میں کسی انسان کا ایک بازو تھا جو کہنی سے توڑا ہوا لگتا تھا۔ اس کے ساتھ پورا ہاتھ تھا۔

ہمارے ایک کانسٹیبل نے پتھر اُٹھا کر کُتے کو مارا۔ ہم سب نے کُتے کو گھیرنے کی کوشش کی اور اُسے پتھر بھی مارتے رہے۔ اُس کے مُنہ سے بازو گر پڑا جو ایک کانسٹیبل نے اُٹھا لیا۔ یہ کسی عورت کا بازو تھا۔ کتا اُدھر سے آیا تھا جہاں گدھ زمین پر اُتر رہے تھے لیکن اُتر کر نظر نہیں آتے تھے۔ وہاں شاید کھڈ تھا۔

ہمیں جیمز اُدھر لے گیا۔ وہاں واقعی کھڈ تھا اور یہ کھڈ گدھوں سے بھرا ہُوا تھا۔ ہم نے پتھروں کی بوچھاڑیں مار مار گدھوں کو اُڑا دیا۔ کھڈ میں جو کچھ رہ گیا وہ بڑا ہی بھیانک تھا۔ یہ انسانی جسم بلکہ ہڈیوں کا پنجر تھا۔ سر الگ پڑا تھا۔ بال بتاتے تھے کہ عورت کا سر ہے۔ چہرہ خراب ہو چکا تھا لیکن اتنا نہیں کہ پہچانا نہ جا سکے۔ یہ ہماری مخبر عورت تھی۔ جسم کے باقی حصوں کی حالت یہ تھی کہ صرف

ہڈیاں رہ گئی تھیں۔ دونوں ٹانگیں اور بازو الگ ہو چکے تھے۔ ایک بازو کتا اُٹھا لے گیا تھا جو اب ہمارے پاس تھا۔ کہیں کہیں گوشت نظر آتا تھا۔ گدھوں نے صفایا کر دیا تھا۔ کھڈ میں ایک گڑھا تھا۔ یہاں مٹی کچی تھی۔ ہم دیکھتے ہی جان گئے کہ گدھوں نے لاش اِس گڑھے سے نکالی ہے۔ گڑھا گہرا نہیں تھا۔

لاش کی حالت ایسی تھی کہ یہ معلوم کرنا ناممکن تھا کہ اسے کس طرح قتل کیا گیا ہے اور قتل سے پہلے اُس کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا ہے۔ اس عورت کا خاوند ساتھ تھا۔ اُس نے کپڑوں کے ٹکڑوں سے اور جُوتی سے بھی پہچان لیا کہ یہ ہڈیاں اور جسم کے ٹکڑے اُس کی بیوی کے ہیں۔ چہرے سے تو ہم سب نے پہچان لیا تھا۔ کھڈ میں انسانی کھرا ایک بھی سلامت نہیں تھا۔ گدھوں، کتوں اور گیدڑوں وغیرہ نے کھرے مٹا دیتے تھے۔ ہڈیوں میں غور سے دیکھا تو زیورات کی دو تین چیزیں مل گئیں۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ قاتل رہزن نہیں تھا، ورنہ وہ سونے کی انگوٹھی اور اتنے وزنی کانٹے چھوڑ کر نہ جاتا۔ قتل کی وجہ کچھ اور تھی، اور وجہ کیا تھی؟

پہلا مشتبہ خاوند تھا۔ دوسرا شک اُس آدمی پر تھا جس کے ساتھ اس عورت کے تعلقات تھے۔ سادھو نے اندھیرے میں جو باتیں سُنی تھیں ان سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ آدمی مقتولہ کے ساتھ بے تکلف تھا۔ ایک شک یہ بھی تھا کہ مقتولہ نے سادھوؤں سے بچے کے دل کا راز حاصل کر لیا تھا جسے چھپانے کے لئے انہوں نے اسے قتل کر دیا۔ لاش کی ہڈیاں اور ٹکڑے اکٹھے کر کے ہم تھانے لے گئے اور ڈاکٹر کے پاس بھیج دیتے۔ مقتولہ کے خاوند اور پانچوں سادھوؤں کو مشتبہ قرار دے کر شاملِ تفتیش کر لیا گیا اور تفتیش کا سلسلہ چل پڑا۔

سادھوؤں سے پوچھا گیا کہ وہ بے اولاد عورتوں کو کیسے کیسے ٹوٹنے بتایا کرتے ہیں۔ انہوں نے بہت سے اوٹ پٹانگ ٹوٹکے بتلتے۔ جیمز نے پوچھا کہ کوئی ایسا ٹوٹکا بھی ہے جس کا تعلق دودھ پیتے بچے کے دل سے ہو؟ اس گروہ کے سرغنہ نے بتایا کہ انہوں نے سُنا ہے کہ نوزائیدہ بچے کا دل نکال کر کسی محلول میں رکھا جاتا ہے، پھر اسے پکا کر بے اولاد عورت کو کھلایا جاتا ہے۔

جیمز نے یہ معلوم کرنے کے لئے کہ اُس نے کسی عورت کو یہ ٹونہ بتایا ہے، اُسے تشدد کی چکی میں ڈال دیا مگر وہ انکار کرتا رہا۔ وہ کہتا تھا کہ وہ سادھو نہیں جرائم پیشہ ہے۔

اُس گاؤں میں جہاں کے بچے کا دل نکالا گیا تھا ہمارے دو مخبر موجود تھے۔ غالباً دو روز بعد ایک مخبر نے تھانے آکر یہ اطلاع دی کہ اس گاؤں میں ایک عامل رہتا ہے جس کے قبضے میں جنات بتاتے جاتے ہیں۔ اُس کے پاس ایک جوان عورت چارپائی پر رسیوں سے باندھ کر لائی گئی ہے۔ اُس کے مُنہ پر کپڑا اٹھونسا ہوا تھا۔ گاؤں کے لوگ تماشا دیکھنے جمع ہو گئے۔ چارپائی عامل کے گھر میں لے جائی گئی۔ لوگ باہر کھڑے رہے۔ کچھ دیر بعد اندر سے اس عورت کی چیخیں اُٹھیں اور اُس نے چلا چلا کر یہ بھی کہا ـــــ "میرا دل نکال لو۔ میرا دل کھا جاؤ"ـــــ اُس کا مُنہ شاید پھر بند کر دیا گیا تھا۔

بہت دیر بعد اُسے اُسی طرح چارپائی کے ساتھ باندھ کر لے گئے۔ لوگوں نے معلوم کر لیا کہ وہ کون سے گاؤں سے لائی گئی ہے۔ مخبر نے وہ گاؤں بتایا تو میں نے سب انسپکٹر جیمز سے کہا کہ ہمارا ایک کانسٹیبل ساجد علی اسی گاؤں کا رہنے والا ہے۔ یہ کانسٹیبل پندرہ دنوں کی چھٹی لے گیا تھا اور ایک ہی روز پہلے واپس آیا تھا۔ کسی عورت کو اس حالت میں کسی عامل کے پاس لے جانا کوئی عجوبہ نہیں تھا۔ عورت پاگل ہو گی، ہسٹیریا کی مریضہ ہو گی یا وہ جنات کے قبضے میں ہو گی لیکن جیمز کا دماغ ان الفاظ پر اٹک گیا ـــــ "میرا دل نکال لو۔ میرا دل کھا جاؤ" ـــــ وہ عقل مند آدمی تھا۔ اُس نے اس گاؤں کے رہنے والے کانسٹیبل کو بلایا اور پوچھا کہ اُس کے گاؤں کی کس عورت کو اس قسم کی تکلیف ہے۔ جیمز نے یہ نہ بتایا کہ عورت نے کیا کہا تھا۔ کانسٹیبل نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

جیمز کا دماغ اس عورت پر اٹک گیا۔ عامل کو تھانے بلایا جا سکتا تھا لیکن جیمز نے بشمبر داس سے کہا کہ وہ رات عامل کے گھر جائے اور اُس سے معلوم کرے کہ اس عورت کو کیا عارضہ ہے۔ بشمبر داس کے ساتھ مجھے بھی جانا

تھا۔ ہم اپنے پرائیویٹ کپڑوں میں گئے۔ عامل سے ملے۔ اُسے بتایا کہ ہم کون ہیں۔ وہ بشمبر داس کو جانتا تھا۔ یہ عامل ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ چہرے پر تراشی ہوئی داڑھی تھی۔ میں بتا نہیں سکتا کہ اُس کی آنکھوں میں کوئی جادو تھا یا کیا اثر تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اُس کی نظریں میرے جسم سے پار ہو رہی ہوں۔ کائیاں آدمی معلوم ہوتا تھا۔ وہ دوائیاں بھی دیتا تھا اور تعویذ بھی اور وہ جن نکالنے میں مشہور تھا۔

بشمبر داس نے اُس سے پوچھا — "آپ کے پاس جس عورت کو لایا گیا تھا اُسے کیا تھا؟"

"اُس پر ایک بدمعاش جن کا قبضہ ہے" — عامل نے جواب دیا — "نکل جائے گا۔"

بشمبر داس نے چند اور باتیں پوچھیں تو عامل نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیئے۔ اُس نے وجدانی سے لہجے میں کہا — "ہم نے دیو نکال دیئے ہیں۔ یہ تو معمولی سا جن ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔"

"میں آپ سے اس عورت کی خیر خیریت معلوم کرنے نہیں آیا" — بشمبر داس نے اُسے کہا — "میں آپ سے مشورہ اور راہنمائی لینے آیا ہوں۔ مجھے یہ بتائیں کہ یہ عورت پاگل تو نہیں؟"

"نہ جی" — اُس نے جواب دیا — "سولہ آنے جن ہے۔"

"یہ دل کا کیا معاملہ ہے؟" — بشمبر داس نے پوچھا — "کس کا دل کس نے نکالا ہے اور کون کس کا دل کھانا چاہتا ہے۔"

عامل چونکا۔ اُس نے کہا — "آپ اس بچے والی واردات کی تفتیش کے لئے آتے ہیں؟"

"جی!" — بشمبر داس نے کہا — "میں اسی سلسلے میں آپ کی مدد حاصل کرنے آیا ہوں۔ اگر آپ کے قبضے میں واقعی جن ہیں تو انہیں حاضر کر کے پوچھیں کہ بچے کا دل کس نے نکالا ہے۔ میں نے سُنا ہے کہ جن اس قسم کے معمّے حل کر دیا کرتے ہیں۔ اگر آپ کے جن صرف دھوکہ ہیں تو مجھے اس سوال کا

جواب دیں کہ اس عورت نے یہ کیوں کہا تھا کہ میرا دل نکال لو۔ میرا دل کھا جاؤ۔"

عامل گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اُس نے سر جھکا لیا۔ اُس نے جنات کو حاضر کرنے کی بات نہ کی۔ بہت دیر بعد اُس نے سر اُٹھایا اور کچھ دیر بشمبر داس کے مُنہ کی طرف دیکھتا رہا۔ بشمبر داس بھی چپ رہا۔ عامل کے چہرے پر کوئی اور ہی رنگ آگیا تھا۔ اُس نے آہستہ سے کہا ـــــ "میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔ آپ جنات کو بھول جائیں۔ بچے کا دل اس عورت کے پیٹ میں گیا ہے۔"

"آپ یقین سے کہہ رہے ہیں؟" ـــــ بشمبر داس نے پوچھا۔

"اپنے تجربے کی بنا پر مجھے یقین ہے" ـــــ عامل نے جواب دیا ـــــ "آپ مجھ سے یہ نہ پوچھیں کہ میرے قبضے میں جن اور چڑیلیں ہیں یا نہیں۔ میرے پاس تجربہ بہت ہے۔ مجھے یہ نہیں بتایا گیا کہ اس عورت نے کوئی ایسی ویسی چیز کھاتی ہے۔ اس کے ساتھ جو آدمی آتے تھے انہوں نے یہ بتایا تھا کہ اسے اچانک 'دیکرا' ہو گئی ہے لیکن عورت جو واہی تباہی بک رہی تھی اس سے پتہ چلتا تھا کہ اُسے کوئی ایسی چیز کھلائی گئی ہے جس نے اُس کے دماغ پر اثر کیا ہے، یا وہ کہیں سے ڈر گئی ہے۔ ایسا ڈر عموماً ویرانوں میں یا قبرستان میں دل پر سوار ہوتا ہے۔ اب آپ نے اس بچے کے دل کا ذکر کیا ہے تو مجھے کچھ شک ہونے لگا ہے۔ مجھے یہ کرامات میرے والدِ بزرگوار نے دی تھی۔ انہوں نے مجھے ایک آدمی کا واقعہ سنایا تھا۔ کسی سنیاسی نے اُسے کہا تھا کہ وہ مُردے کی کھوپڑی کا ایک تولہ ٹکڑا پیس کر مکھن میں ملا کر کھا لے۔ اس آدمی کو کوئی بیماری تھی۔ اُس نے قبرستان سے کسی بہت ہی پرانی قبر سے کھوپڑی نکالی اور اس کا ایک ٹکڑا گھر لا کر پیسا، پھر اسے مکھن میں ملا کر کھا گیا۔ رات کو وہ ڈر گیا اور چیخیں مارنے لگا۔ وہ چھپتا پھرتا تھا۔ دیواروں سے سر مارتا اور کہتا تھا ـــــ میرا سر توڑ دو۔ میری کھوپڑی توڑ دو۔"...

"گھر والے اُسے میرے والد کے پاس لاتے اور بتایا کہ اس نے انسانی کھوپڑی کھاتی ہے۔ وہ ٹھیک نہیں ہو سکا۔ بڑی بُری حالت میں مر گیا تھا۔ یہ

عورت بار بار کہتی تھی کہ میرا دِل نکال لو۔ میرا دل کھا جاؤ۔ میں معلوم کر سکتا ہوں کہ اس عورت کی یہ حالت کیوں ہوتی ہے۔ میرے پاس ایک دوائی ہے جو اُسے سونگھا کر میں اُس کے دماغ پر تھوڑی سی دیر کے لئے قابو پا سکتا ہوں۔ اُس کے گھر والوں سے بھی پوچھنے کی کوشش کروں گا کہ اسے کیا کھلایا گیا ہے"۔

عامل نے صاف الفاظ میں تو کوئی ایسی بات نہ کہی لیکن اُس کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا جیسے اُس کے قبضے میں کوئی جن نہیں ہے اور جو کچھ اُس کے قبضے میں ہے وہ اس کا تجربہ اور قیافہ شناسی کا فن ہے۔ بشمبر داس نے اُس سے پوچھا کہ کوئی ایسا ٹوٹکا بھی ہے جس میں دودھ پیتے بچے کا دل استعمال ہوتا ہے؟

"یہاں کیا نہیں ہوتا"— اُس نے جواب دیا —"زیادہ تر ٹوٹکے بے اولاد عورتیں کرتی ہیں۔ اگر میں سب کو بتا دوں کہ بے اولاد عورتیں کیسے کیسے جتن کرتی ہیں تو تمام بے اولاد عورتوں کو طلاق مل جاتے۔ جن عورتوں کو یہ دھمکی ملتی ہے کہ اُسے بچہ نہ ہوا تو طلاق مل جاتے گی وہ تو کسی کے معصوم بچے کا دل نکالنے کی بجاتے اُس کی آنکھیں نکالنے کو بھی تیار ہو جاتی ہیں"— اُس نے کہا —"کل مجھے اس عورت کے گاؤں بلایا گیا ہے۔ میں صبح جا رہا ہوں۔ دوپہر تک آپ مجھ سے جواب لے لیں"۔

"آپ کو یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ میں پولیس کا افسر ہوں"— بشمبر داس نے کہا —"میں آپ سے توقع رکھوں گا کہ آپ مجھے چکر دینے کی کوشش نہیں کریں گے۔ آج بھی آپ نے شروع میں مجھے ٹالنے کی کوشش کی تھی"۔

"میں آپ کی آمد کا مقصد غلط سمجھا تھا"— اُس نے کہا —"میں یہ سمجھا تھا کہ آپ اپنے کانسٹیبل کی بیوی کے متعلق فکر مند ہیں اور مجھے پولیس کا رعب دے کر یہ کہیں گے کہ میں اُس کا علاج توجہ سے کروں"۔

میں حیران ہُوا کہ یہ کون سے کانسٹیبل کی بیوی کا ذکر لے بیٹھا ہے۔

بشمبر داس نے پوچھا — "میں کسی کانسٹیبل کی بیوی کے متعلق فکر مند نہیں۔ آپ کس کی بات کر رہے ہیں؟"

عامل میری اور بشمبر داس کی حیرت پر حیران ہوا اور بولا — "کیا آپ کو معلوم نہیں کہ یہ عورت آپ کے تھانے کے کانسٹیبل ساجد علی کی بیوی ہے؟"

حیرت زدگی سے بشمبر داس نے منہ کھول کر مجھے دیکھا اور میں نے آنکھیں پھاڑ کر اُسے دیکھا۔ مجھے یاد آگیا کہ سب انسپکٹر جیمز نے ساجد علی سے پوچھا تھا کہ تمہارے گاؤں کی کس عورت پر آسیب سوار ہے۔ ساجد علی نے لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔ مجھے یہ بھی یاد آگیا کہ ساجد علی کو شادی کئے نو دس سال گزر گئے تھے اور وہ بے اولاد تھا۔ وہ بہت پریشان رہنے لگا تھا۔ وہ تعویذوں، مزاروں، پیروں اور خانقاہوں کی باتیں کرتا رہتا تھا۔ اب وہ پندرہ دنوں کی چھٹی لے کر گیا تھا۔ کہتا تھا کہ ایک خانقاہ پر یا غالباً کسی نئے پیر کے پاس جائے گا۔

عامل کو بشمبر داس نے کچھ باتیں بتائیں اور ہم وہاں سے تھانے کو چل پڑے۔ میں نے راستے میں بشمبر داس کو یاد دلایا کہ کانسٹیبل ساجد علی بھی بے اولاد ہے اور پریشان رہتا ہے اور یہ بھی کہ اُس نے کہا تھا کہ اُسے معلوم نہیں کہ اُس کے گاؤں کی کسی عورت کو آسیب ہے۔ بشمبر داس نے بھی شک کا اظہار کیا۔ تھانے جا کر ہم نے جیمز کو پوری رپورٹ دی۔ اُس نے مجھے اور بشمبر داس سے کہا کہ ساجد علی کو نظر میں رکھا جائے اور اُسے کہیں باہر نہ جانے دیا جائے۔ اگر وہ بتا دیتا کہ اُس کی بیوی کو کوئی پُراسرار تکلیف ہو گئی ہے تو اُس پر شک نہ کیا جاتا۔ اُس نے جھوٹ بول کر اپنے آپ کو مصیبت میں ڈال لیا۔

جیمز نے کہا — "مجھے کچھ ایسے نظر آرہا ہے جیسے بچے کے دل والا مسئلہ حل ہو گیا ہے، مگر اپنی مخبر کے قاتل کی تلاش محال نظر آتی ہے۔"

دوسرے دن کانسٹیبل ساجد علی نے مجھ سے پوچھا کہ میں رات بشمبر داس

کے ساتھ کہاں گیا تھا۔ میں نے جھوٹ بولا۔ میں نے اُسے غور سے دیکھا۔ وہ زیادہ ہی پریشان نظر آ رہا تھا۔ بعد دوپہر میں، بشمبر داس کے ساتھ عامل کے گاؤں چلا گیا۔ اُس نے یہ خوشخبری سنائی کہ کانسٹیبل ساجد علی کی بیوی نے بچے کا دل بھون کر کھایا ہے۔ عامل نے اُسے الگ کمرے میں بند کر کے کوئی جڑی بوٹی کھلائی یا سونگھائی، پھر اُس سے پوچھا کہ اُس نے کیا کھایا ہے یا کیا کیا ہے۔ عورت نے بتا دیا کہ وہ اپنے خاوند کے ساتھ ایک سادھو کے پاس گئی تھی۔ یہ کوئی اور سادھو تھا۔ اُس نے بتایا تھا کہ دو تین ماہ کی عمر کا کوئی بچہ مر جاتے تو جس رات اُسے دفن کیا جاتے اُسی رات اُس کا دل نکال کر آگ پر بھونا جاتے اور یہ اسے کھلا دیا جاتے۔

عامل نے ہمیں بتایا کہ عورت اتنا ہی بیان دے کر پھر چیخنے لگی —— "میرا دل نکال لو۔ میرا دل کھا لو" —— اُس نے اپنے بال نوچے، اپنا چہرہ نوچا اور اُسے رسیوں سے باندھ دیا گیا۔

ہم نے جیمز کو رپورٹ دی تو اُس نے ساجد علی کو بلا کر کہا —— "تم پولیس کے آدمی ہو۔ اگر تمہارے دل میں یہ خیال ہے کہ تم مجھے بیوقوف بنا لو گے تو یہ خیال دل سے نکال دو۔ تم نے یہ کیوں کہا تھا کہ تمہیں معلوم ہی نہیں کہ تمہارے گاؤں میں کسی عورت کو کوئی خطرناک تکلیف ہے؟ تم مجھے جانتے ہو۔ میں جال پھیلا کر ملزموں کو پکڑا کرتا ہوں۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ ہمارے مخبر ہر جگہ موجود ہیں اور ان سے تم کچھ بھی نہیں چھپا سکتے۔ آرام سے اقبال جرم کر لو ورنہ اپنا انجام تم جانتے [illegible] کیا ہو گا۔ میرے پاس پوری شہادت آگئی ہے۔"

ساجد علی سب انسپکٹر جیمز سے اچھی طرح واقف تھا۔ میں پاس کھڑا تھا۔ میں نے اُسے کہا —— [illegible] تمہارے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔ میں اُس عامل کے گاؤں میں بہت سا [illegible] ر آیا ہوں جس کے پاس تمہاری بیوی کو لے گئے تھے، اور میں تمہارے گاؤں سے بھی ہو آیا ہوں۔ تم ہمارے بھائی ہو۔ میں جیمز صاحب کے پاؤں پکڑ کر تمہاری مدد کے لئے کچھ کرا لوں گا۔ واردات خود ہی سنا دو۔"

"آپ میری مدد کریں گے؟" — اُس نے جیمز سے پوچھا۔

جیمز نے مدد کا وعدہ کیا تو ساجد علی نے ایک کی بجائے دونوں وارداتوں کا اقبال کر لیا۔ اُس نے بتایا کہ اُس کی بیوی اُس کے خاندان اور برادری کی نہیں۔ وہ کسی دوسرے گاؤں کی رہنے والی تھی۔ شادی کو دو ہی سال ہوتے تھے کہ وہ بیوہ ہو گئی۔ اُس وقت ساجد علی اُس کے علاقے کے تھانے میں تھا۔ اُس نے اس عورت کے ساتھ مراسم پیدا کر لیے جو اتنے گہرے ہو گئے کہ یہ عورت اس کے پیچھے گھر سے نکل آئی۔ ساجد علی نے اُسے اپنے گاؤں لا کر شادی کر لی۔ ساجد علی کی برادری نے اس عورت کو بہت پریشان کیا۔ ساجد علی کو اُس کے خلاف اُکسایا اور بھڑکایا بھی گیا لیکن یہ دلی محبت کا معاملہ تھا۔ ساجد علی نے اپنی بیوی کی ایسی حفاظت کی کہ رشتہ داروں کے ساتھ لڑائی جھگڑے تک بھی نوبت آئی۔ ساجد علی جرأت والا آدمی تھا۔ پولیس کا کانسٹیبل بھی تھا، اُس نے سب کو دبا لیا۔

تین چار سال گزر گئے تو اُس کے بچہ نہ ہوا۔ یہ اس کی بیوی کا ایسا جرم تھا جو کسی بھی بیوی کے سسرال معاف نہیں کیا کرتے۔ ساجد علی کے والدین نے ایک بار پھر کھسر پھسر شروع کر دی۔ قریبی رشتہ دار بھی اس نئی مہم میں شامل ہو گئے۔ ساجد علی حکیموں اور سیانوں کے پاس گیا۔ جس نے جو نسخہ یا طریقہ بتایا اُس نے آزمایا مگر اثر صفر رہا اور سال گزرتے چلے گئے۔ آپ جانتے ہیں کہ جس مرد کی اولاد نہ ہو وہ اس میں اپنی مردانگی کی توہین سمجھتا ہے۔ اسی لئے بے اولاد عورت کو طلاق مل جاتی ہے۔ نقص خواہ خاوند میں ہی ہو۔ ساجد علی کے دل میں بیوی کی محبت اتنی گہری اتری ہوئی تھی کہ اُس نے طلاق کا نام بھی دل میں نہ آنے دیا۔

محبت کے علاوہ ساجد علی نے یہ بھی سوچ لیا تھا کہ اُس کے رشتہ دار پہلے روز سے اُسے کہہ رہے تھے کہ اسے طلاق دے دو مگر وہ ڈٹا رہا۔ اب رشتہ داروں کو ایک اور بہانہ مل گیا تھا۔ دو گھروں سے اُسے لڑکیاں پیش کی گئیں لیکن اُس نے اسے اپنی شکست سمجھا اور اُس نے یہ بھی سوچا کہ جو عورت

اپنے گھر اور عزیزوں کو اُس کی خاطر ہمیشہ کے لئے چھوڑ آئی تھی وہ کہاں جائے گی اور اُس کے عزیز اُس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔ اُس کے ساتھ کوئی شادی نہیں کرے گا۔ ساجد علی نے اپنی بیوی کی قربانی کے جواب میں قربانی دینے کا ارادہ کرلیا۔ اُس نے ہمارے تھانے میں تبادلہ کرا لیا تھا۔ اس تھانے میں اُسے ایک ہی سال گزرا تھا۔

آخر یہ دن آ گئے۔ شادی کے نو دس سال گزر گئے تھے۔ ساجد علی نے پندرہ دنوں کی چھٹی لے لی۔ اُسے کسی نے پانچ چھ میل دُور ایک سادھو کا پتہ دیا تھا۔ ساجد علی اُس کے پاس گیا تھا۔ سادھو نے جتنی رقم مانگی اُس نے دی۔ سادھو نے اُسے بتایا کہ تین ماہ کے اندر اندر کی عمر کے بچّے کا دل نکال کر بیوی کو کھلایا جائے۔ اس کے سوا کوئی اور علاج نہیں۔ اس سے پہلے ساجد علی کئی ٹونے کر چکا تھا۔ اُس نے جنگل میں گھوم پھر کر بڑی ہی مشکل سے ایک سانپ مارا تھا اور اُس پر ٹوکرا رکھ کر ٹوکرے پر بیوی کو نہلایا بھی تھا۔ اُس نے رات کے وقت قبرستان سے ایسی قبر سے جو بہت پرانی ہونے کی وجہ سے بہہ گئی تھی، انسانی کھوپڑی کے ٹکڑے اٹھائے اور ایک سیانے سے اس کی دوائی بنوائی تھی۔ یہ بھی ناکام ہو گئی تھی۔

کسی بچّے کا دل حاصل کرنا ممکن نہیں تھا۔ ایک ہی طریقہ تھا کہ کسی کا دودھ پیتا بچہ اغوا کیا جائے، پھر اسے قتل کر کے اس کا دل نکالا جائے۔ ساجد علی نے اپنی بیوی کو بتایا کہ یہ ٹونہ کرنا ہے اور کسی کا بچہ اُٹھانا ہے۔ بیوی ڈر گئی۔ ساجد علی کی چھٹی میں چند دن باقی تھے۔ ایک روز وہ اس گاؤں کے قریب سے گزرا جس کے بچّے کی لاش قبر سے نکالی گئی تھی۔ اُس نے قبرستان کی طرف ایک جنازہ جاتا دیکھا۔ اُس نے دیکھ لیا کہ میت جو ایک آدمی نے ہاتھوں پر اُٹھا رکھی تھی چھوٹے سے بچّے کی تھی۔ وہ جنازے میں شامل ہو گیا اور پوچھا کہ بچہ کس کا تھا اور عمر کتنی ہے۔ اُسے پتہ چلا کہ بچہ ابھی تین ماہ کا نہیں ہوا تھا۔ ساجد علی نے بچّے کا دل نکالنے کا ارادہ کرلیا۔

جنازے سے فارغ ہو کر وہ اپنے گاؤں گیا۔ اگر اُس کے گھر کے حالات

اُس روز اور نہ بگڑ جاتے تو شاید وہ اتنا بھیانک جرم نہ کرتا۔ وہ گھر گیا تو اُس کی بیوی رو رہی تھی اور اُس کی ماں گالیاں بک رہی تھی۔ وہ ساجد پر بھی برسنے لگی۔ اُس نے اُسے بے اولاد ہونے کے طعنے دیئے۔ منحوس کہا اور جو مُنہ میں آیا بک ڈالا۔ فضا اتنی زیادہ خراب تھی جس سے ساجد کا دماغ بھی خراب ہو گیا۔ وہ کوئی تعلیم یافتہ اور سُلجھا ہُوا آدمی تو نہیں تھا۔ دو تین جماعت پاس کانسٹیبل تھا اور دیہاتی۔ اُس نے ماں کو للکار کر کہا کہ اُس کی بیوی اسی گھر میں رہے گی اور وہ بچہ جنے گی۔ چنانچہ اُس کے دل میں مرے ہوتے بچے کا دل نکالنے کا ارادہ اور زیادہ پختہ ہو گیا۔

رات کو وہ بیوی کو بتا کر چلا گیا۔ اُس کے پاس ایک بیلچہ اور ایک چاقو تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ بچے کی قبر کہاں ہے۔ بچے کی قبر خالی کرنا کوئی مشکل نہیں تھا۔ تین ماہ کے بچے کی قبر چھوٹی سی تھی۔ یہ اُسی روز کی قبر تھی۔ ساجد علی کو مٹی نکالنے کوئی زیادہ وقت بھی نہ لگا اور زیادہ مشقت بھی نہیں کرنی پڑی۔ لحد پر اینٹیں تھیں۔ اُس نے اینٹیں ہٹائیں۔ بچے کی لاش باہر نکالی۔ چاقو سے اُس کی نیچے والی پسلی سے پیٹ چاک کیا اور ہاتھ اندر ڈال کر دل نکال لیا۔ چاقو تیز تھا۔ اندھیرے میں بھی اُس نے کام صحیح طریقے سے کر لیا۔ لاش لحد میں رکھی اور اینٹیں جگہ پر جانے کی بجائے قبر میں رکھ دیں اور اُوپر مٹی ڈال دی۔ مٹی لحد میں چلی گئی۔ قبر کی شکل بگڑ گئی۔ ساجد علی اگر صحیح طریقے سے قبر بند کرتا تو شاید کسی کو شک نہ ہوتا لیکن جُرم کے ارتکاب کے لئے صرف دلیری اور جذبات کی نہیں عقل کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

وہ دل نکال کر لے گیا۔ گھر میں سب سوتے ہوتے تھے۔ صرف بیوی جاگ رہی تھی کیونکہ اُسے معلوم تھا کہ اُس کا خاوند کون سی مہم پر گیا ہے۔ خاوند آ گیا۔ اُس نے بیوی سے کہا کہ چولہا جلاؤ اور یہ بھُون کر کھا جاؤ۔ ساجد علی نے اپنے اقبالی بیان میں اپنی بیوی کا ردِ عمل یہ بتایا کہ اُس نے جب بچے کا ذرا سا دل اپنے ہاتھ میں لیا تو اُس کا ہاتھ صاف کانپتا نظر آیا۔ اُس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ اُس نے ساجد علی کی طرف دیکھا تو اس عورت کے آنکھوں کے ڈھیلے باہر کو آ رہے

تھے۔ مختصر یہ کہ خوف نے اُس کی جان نکال دی۔ ساجد علی نے اُسے حوصلہ دیا بلکہ اپنے ہاتھوں دل کے چار ٹکڑے کر کے گھی میں تلے اور بیوی کو کھلا دیئے۔ بیوی کی حالت اُسی وقت غیر ہونے لگی۔

رات جاگتے گزار دی۔ صبح اُس کی دماغی حالت اور زیادہ بگڑ گئی اور اُس نے ہذیان بکنا شروع کر دیا۔ گھر میں اور کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ اصل باعث کیا ہے۔ ساجد علی نے رات کے اندھیرے میں جرم تو کر لیا مگر دن کی روشنی میں اُس کے دل پر خوف سوار ہو گیا۔ اُس نے اپنی بیوی کو چوری چھپے دلیسی شراب پلا دی جو وہاں عام مل جاتی تھی۔ دیہاتی خود ہی کشید کیا کرتے تھے۔ اس سے وہ سنبھل گئی اور سو گئی۔ ساجد علی پولیس کا آدمی تھا۔ اُسے خیال آگیا کہ وہ قبر کو صحیح طریقے سے بھر کر نہیں آیا تھا، ہو سکتا ہے اُس کا جرم بے نقاب ہو گیا ہو۔ وہ جاسوسی کے لئے اُس گاؤں کے قبرستان کی طرف چلا گیا۔ ابھی وہاں تک پہنچا نہیں تھا کہ ایک آدمی راستے میں ملا جس نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر اُسے بتایا — "بھائی صاحب! یہ ظلم دیکھو۔ انسان بھی بھیڑیئے بن گئے ہیں۔ رات کو کوئی آدمی ایک بچے کی قبر کھود کر بچے کا دل نکال کے لے گیا ہے۔ قبرستان میں پولیس اُتری ہوتی ہے۔ سب کہتے ہیں کہ بچے کا دل کسی انسان نے سینہ چاک کر کے نکالا ہے۔ کوئی درندہ اس طرح نہیں کر سکتا۔"

ساجد علی وہیں سے واپس آگیا اور اُس نے جاسوسوں کی طرح یہ دیکھنا شروع کر دیا کہ پولیس کیا کارروائی کرتی ہے۔ تھانے کے ایک ہندو کانسٹیبل کا نام لے کر ساجد علی نے بتایا کہ اُس نے اس ہندو سے چوری ملاقات کر کے معلوم کر لیا کہ کیا کارروائی ہو رہی ہے۔ دوسرے دن بچے کے گاؤں جا کر اُس نے چوکیدار سے بھی کچھ باتیں معلوم کر لیں۔ اُس کی ملاقات مقتولہ (مخبر عورت) سے بھی ہوئی۔ ساجد علی کو سب جانتے تھے۔ ہر کسی کو معلوم تھا کہ وہ کانسٹیبل ہے اس لئے اُس سے کوئی بھی کوئی بات نہیں چھپاتا تھا۔ اُسے یہ بھی پتہ چل گیا کہ مخبر عورت کو استعمال کیا جا رہا ہے۔ یہ عورت پہلی بار سادھو کے پاس گئی تو دوسرے دن کانسٹیبل نے اُس کے گاؤں جا کر اُس سے معلوم کر

لیا کہ وہ کیا خبر لاتی ہے۔

اس سے اگلے روز بھی وہ اِس عورت سے ملا۔ سب انسپکٹر جیمز نے اُسے سختی سے کہہ دیا تھا کہ وہ کسی کو کوئی بات نہ بتلائے۔ اس حکم کا ساجد علی کو علم نہیں تھا۔ عورت نے اُسے کچھ بھی بتانے سے انکار کر دیا۔ ساجد علی کے دماغ پر بڑا ہی ہیبت ناک جُرم سوار تھا۔ گھر میں اُس کی بیوی کی دماغی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔ ساجد علی کی عقل ماری گئی۔ اُسے یہ وہم ہو گیا کہ اِس عورت نے کوئی سراغ لگا لیا ہے۔ تیسری شام وہ اُس غار کے قریب کہیں چھُپ گیا جس میں یہ پانچ سادھو رہتے تھے۔ مخبر عورت کو وہاں جانا تھا۔ ساجد علی نے اُسے غار کی طرف جاتے دیکھا۔ واپسی کے وقت اندھیرا ہو گیا تھا۔ عورت واپس گئی تو ساجد علی اُسے راستے میں اس طرح ملا جیسے اچانک آمنا سامنا ہو گیا ہو۔

عورت نے اُسے پہچان لیا اور ان کے درمیان وہ باتیں ہوئیں جو ایک سادھو نے سُنی تھیں اور ہمیں بتائی تھیں۔ انہی باتوں سے ہم نے اندازہ لگایا تھا کہ عورت کو ایسا آدمی ملا جو اُسے اچھی طرح جانتا تھا۔ ساجد علی نے اُسے کہا کہ وہ رات کے وقت اِس بیابان میں اکیلی نہ جائے، وہ اُس کے ساتھ چلے گا۔ اُس نے عورت کو ایک اور راستے پر یہ کہہ کر ڈال دیا کہ یہ راستہ چھوٹا ہے اُس نے عورت سے پوچھا کہ وہ کیا کچھ حاصل کر چکی ہے۔ عورت نے اُسے بتایا کہ سب انسپکٹر نے اُسے بڑا سخت حکم دیا ہے کہ کسی کو کچھ نہ بتانا۔ ساجد علی نے عقل سے کام نہ لیا، کانسٹیبلی کا رُعب جھاڑا۔ عورت بگڑ گئی۔ اُس نے کہا — "تم دو ٹکے کے سپاہی ہو۔ میں تو داروغوں کو بھی مُٹھی میں رکھتی ہوں"۔

ساجد علی نے اور زیادہ رُعب جھاڑ کر کہا کہ بتاؤ تمہاری رپورٹ کیا ہے۔

عورت نے جواب دیا — "تم کیوں اتنی دلچسپی لے رہے ہو؟ گاؤں میں آ کر مجھ سے بھید لیتے رہو۔ اب پھر میرے پیچھے پڑ گئے ہو۔ تم شاید ملزم کو جانتے ہو"۔

تکرار اور بڑھی تو عورت نے کہا — "میں داروغہ کو یہ بھی بتا دوں گی کہ تم مجھ سے بھید لیتے ہو"۔

ساجد علی نے اُس کی گردن دبوچ لی اور اُسے جان سے مار دیا۔ وہ اسی

ارادے سے آیا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں گز بھر لمبا موٹا ڈنڈا تھا جس کے ساتھ برچھی کی طرح چوڑی اَنی لگی ہوئی تھی۔ اُس نے لاش کندھوں پر اُٹھائی اور ایک کھڈ میں اُتر گیا۔ زمین پتھریلی نہیں تھی۔ اُس نے برچھی سے زمین کھودی۔ لاش وہاں رکھی اور اوپر مٹی ڈال دی۔ گڑھا گہرا نہیں تھا۔

وہ گھر چلا گیا۔ اُس نے بیوی کو نہ بتایا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ بیوی کو تو ہوش ہی نہیں تھی کہ اُس کا خاوند گھر میں ہے یا کہاں ہے۔ وہ ہذیانی حالت میں مبتلا تھی۔ اُسی روز اُس کی یہ حالت ہو گئی کہ اپنے بال اور چہرہ نوچنے لگی۔ اُس نے کپڑے پھاڑ ڈالے اور چلّانے لگی ——"میرا دل نکال لو، میرا دل کھا لو"——

ساجد علی کی اپنی حالت بھی بگڑنے لگی۔ اُسی رات اُس نے خواب میں ایک بچہ دیکھا جس کی عمر تین ماہ تھی۔ بچہ اُس کے سینے میں داخل ہو گیا۔ ساجد علی کی آنکھ کھُل گئی۔ وہ اتنا ڈرا ہوا تھا کہ اُس کا جسم پسینے میں ڈوب گیا۔ اُس کی بیوی سو گئی تھی۔ وہ اچانک جاگ اُٹھی اور اُس نے چیخنا چلّانا شروع کر دیا۔

گھر والے جاگ اُٹھے۔ گاؤں کی تین چار عورتیں آ گئیں۔ اُس وقت تک اسی گاؤں کا کوئی آدمی بیوی پر دم درود کر رہا تھا۔ اُس نے بتایا تھا کہ یہ جنات کا قبضہ ہے۔ پھر اُسے ایک اور جگہ لے گئے۔ وہاں سے بھی تعویذ ملے اور تصدیق ہوئی کہ جنات کا قبضہ ہے۔ اس کے بعد اس عامل کی باری آئی جو بچے کے گاؤں میں رہتا تھا۔ اب تو عورت کی حالت اتنی بگڑ گئی تھی کہ مردوں کے قابو میں بھی نہیں آتی تھی۔ سب جنات کا قبضہ سمجھ رہے تھے۔ ساجد علی کی چھٹی پوری ہو گئی تھی۔ وہ اپنی بیوی کو اسی حالت میں چھوڑ کر تھانے میں حاضر ہو گیا۔ وہ ہار گیا تھا۔ اُس کی دلیری اور جوانمردی جواب دے گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اُس نے اقبالِ جرم کرتے دیر نہ لگائی ورنہ پولیس کے کسی آدمی سے اقبالِ جرم کرانا آسان نہیں ہوتا۔

عامل نے ہماری بہت مدد کی تھی۔ اُس نے اپنی وہ دوائی ڈاکٹر کو بھی دکھائی تھی جو اُس نے ساجد علی کی بیوی کو دی تھی۔ وہ کہتا تھا کہ اس کا اثر عارضی ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے کمرے میں مریضہ کو نہار کھ کر کہا تھا کہ جب تک وہ بتاتے گی نہیں کہ اُس نے کیا کھایا یا کیا غلط حرکت کی ہے اُس کی جان عذاب میں رہے گی۔

اُس نے بتا دیا کہ اُس کے خاوند نے اُسے انسان کے بچے کا دل کھلایا ہے۔

جیمز نے ساجد علی سے وعدہ کیا تھا کہ اُس کی مدد کرے گا لیکن اُس کے دونوں جرائم اتنے بھیانک تھے کہ جیمز نے پوری محنت اور دیانتداری سے مقدمہ تیار کیا۔ کہیں کوئی کمی نہ رہنے دی۔ ساجد علی کو بچے کا دل نکالنے کے جرم میں سات سال اور قتل کے جرم میں عمر قید، عبور دریائے شور (کالا پانی) کی سزا ہوئی۔

اُس کی بیوی ٹھیک نہیں ہو سکی تھی۔ تھوڑے ہی عرصے بعد مر گئی تھی۔

صُوبیدار اور اردلی

کتوں کا شکار میں نے بھی کھیلا تھا لیکن صرف ایک بار۔ اُسی شکار میں ایسا واقعہ ہو گیا جس نے دوسری بار شکار پر جانے کی ہمت اور جرأت ہی ختم کر دی۔

میں اپنے بارے میں چند تعارفی الفاظ لکھنے کی اجازت چاہوں گا۔ میں بھارتی مسلمان ہوں۔ آپ اپنے رسالے میں فرماتے رہتے ہیں کہ بھارت میں مسلمان خوف و ہراس دل میں لئے اور جذبوں کو سینے میں دفن کئے ہوئے زندگی کا سفر پورا کر رہے ہیں۔ میں تو اپنے خاندان کے ساتھ اس بُت پرست ملک کے قلب میں رہتا ہوں۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اذان بھی ہم ڈرتے ڈرتے دیتے ہیں۔ مؤذن کی آواز میں وہ جوش اور سوز نہیں ہوتا جو پاکستان میں ہوتا ہو گا۔ مؤذن کی آواز میں رعشہ ہوتا ہے۔ یقین کیجئے کہ جب مسجد میں اذان ہو رہی ہوتی ہے اور ہم مسجد کی طرف جا رہے ہوتے ہیں تو ہندوؤں کی پیشانیوں پر حقارت کے شکن صاف نظر آتے ہیں۔ چار مرتبہ اذان کے مسئلہ پر ہی ہندو ہم پر یلغار کر چکے ہیں۔ ہر بار ہم ہی زخمی ہوتے اور گرفتار ہونے والوں کی فہرست میں بھی ہمارے نام ہی سب سے اُوپر تھے۔

معذرت خواہ ہوں، میں نے اپنے رنج و الم کی داستان شروع کر دی ہے۔ آزادی کے بعد آج پہلی مرتبہ سینے کے داغ کسی بھائی کو دکھا رہا ہوں۔ جہاں تک آزادی کا تعلق ہے وہ ہندوستان کو ملی تھی یا ہندوؤں کو۔ یا آپ آزاد ہوتے۔ ہم تو غلامی کے بدترین اور رُوح کش دَور میں پھینک دیئے گئے ہیں۔ پہلی بار اس ملک سے عارضی طور پر نکلنے کا موقع اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے۔

سعودی عرب میں اپنے بیٹے کے پاس بغرض عمرہ آیا ہوا ہوں۔ میرا بیٹا، اللہ اسے اور سب کے بیٹوں کو عمرِ خضر عطا فرماتے، سعودی عرب میں چار سال سے ملازم ہے۔ اُسی نے میری عاقبت کی خاطر مجھے عمرے کے لئے بلایا ہے۔ آخری عمر کی یہی ایک خواہش تھی۔

یہاں آیا تو بڑھاپے کی فراغت نے مجبور کیا کہ بیٹے کی کتابوں والی الماری کی تلاشی لوں۔ پورے کا پورا ایک ریک مکتبۂ داستان کی کتابوں اور "حکایت" کے پچھلے بہت سے شماروں سے بھرا پڑا تھا۔ "حکایت" پاکستان کا پہلا رسالہ ہے جو میں نے دیکھا ہے۔ میرے بیٹے نے مجھے بتایا ہے کہ بھارت میں "حکایت" پڑھنا ممنوع ہے۔ ممنوع ہونا ہی چاہیئے کیونکہ آپ اپنے پاکستانی قارئین کو ہندو کے مُنہ سے نکلی ہوئی رام رام نہیں سناتے بلکہ اُس کی بغل میں چُھپی ہوئی چھُری دکھاتے ہیں ——— اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

میں نے ایک مہینے میں "حکایت" کے تمام شمارے جو اپنے بیٹے کے ریک سے نکلے، پڑھ ڈالے ہیں۔ "کہنے کی بات" آپ بھی لکھتے ہیں جو حق گوئی اور بے باکی کی مظہر ہے لیکن کہنے کی باتیں تو ہمارے سینے میں ہیں جو ہم اپنی چار دیواری کے اندر بیٹھ کر کہنے سے بھی ڈرتے ہیں۔ میں نے کہانیاں بھی پڑھیں۔ ان میں جناب صابر حسین راجپوت کی کُتوں کے شکار کی کہانیاں کچھ زیادہ ہی اچھی لگیں۔ ان کہانیوں نے یہ واقعہ یاد دلایا جو میں آپ کو سنا رہا ہوں۔ اتنی لمبی تمہید باندھنے کا مقصد آپ کو یہ بتانا ہے کہ میں اُس علاقے کا نام نہیں لکھ سکوں گا جس کا یہ واقعہ ہے۔ میں اپنی شناخت پوشیدہ رکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ پاکستان کے "حکایت" جیسے پرچے کے ساتھ کسی بھارتی مسلمان کا رابطہ جُرم سے کم نہیں ہوگا۔ قارئین کرام کو غرض آم کھانے سے ہونی چاہیئے۔ اس سے کیا دلچسپی کہ یہ کون سے پیڑ سے اُترے ہیں۔

اُس وقت میں نوجوان تھا۔ میرے تین مسلمان دوستوں نے اور اُن میں سے ایک کے ایک ہندو دوست نے کُتے رکھے ہوتے تھے۔ میرے ایک مسلمان دوست کے پاس لڑنے والا خونخوار کُتا تھا۔ وہ غالباً اُسی نسل کا کُتا تھا

جس کا ذکر جناب صابر حسین راجپوت نے اپنی کہانیوں میں کیا ہے۔ اُسے وہ بُوہلی کہتے ہیں۔ میں کُتوں کے متعلق کچھ نہیں جانتا البتہ ہندوؤں کی ہر نسل کے متعلق اتنا زیادہ جانتا ہوں جتنا سپیرے سانپوں کی قسموں کو جانتے ہیں۔ میں یہ جانتا تھا کہ اس کُتے کو بُلڈاگ کہتے ہیں۔

ایک روز ہم سب دوست خوش گپیوں میں مشغول تھے کہ ایک دوست کے مشورے پر کُتوں کے شکار کا پروگرام بن گیا۔ ہم میں سے کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ کُتوں سے شکار کس طرح کھیلا جاتا ہے۔ بس اتنا سوچا تھا کہ جو بھی شکار نظر آیا اُس کے پیچھے کُتوں کو دوڑا دیں گے۔

جس دوست کے پاس بُلڈاگ تھا وہ ایک ریٹائرڈ صوبیدار کا بیٹا تھا۔ اُن کے گھر میں عربی نسل کی گھوڑی بھی تھی۔ آج کل جس طرح لوگ کار رکھ کر فخر کرتے ہیں، ایسا ہی فخر اُس دَور میں گھوڑا رکھ کر کیا جاتا تھا۔ کار امارت کا تاثر پیدا کرتی ہے لیکن گھوڑے یا گھوڑی پر بیٹھ کر مردانگی اور جرأت مندی کا تاثر اُبھرتا تھا۔ گھوڑے پر سوار آدمی پُر وقار لگتا تھا۔ ہمارے ایک اور دوست کے گھر میں بھی گھوڑی تھی۔

اب ہمارا گاؤں قصبہ بن چکا ہے، میری نوجوانی میں یہ بڑا پیارا سا گاؤں ہوا کرتا تھا۔ گاؤں سے ایک ہی میل دُور سے گھنا جنگل اور پہاڑی علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔ وہاں ہرن بھی ہوتے تھے اور نیل گاتے بھی۔ خرگوش بھی دیکھے گئے تھے۔

ایک روز صبح کے وقت ہم شکار کھیلنے کے لئے گھروں سے نکلے۔ چار کُتے تھے۔ اس کے ساتھ ہم چھ دوست تھے۔ گھوڑیوں والے دوست گھوڑیاں لے آتے تھے۔ ہم نے طے کیا تھا کہ باری باری گھوڑیوں پر سوار ہوں گے۔ کُتوں والے دوست کہتے تھے کہ کُتے کسی ہرن کے پیچھے دوڑیں گے تو دو لڑکے گھوڑیوں پر اُن کے ساتھ ہوں گے۔ ہم میں سے کسی کو بھی معلوم نہیں نہیں تھا کہ کُتے ہرن کی رفتار سے دوڑ بھی سکیں گے یا نہیں۔ ہم تو اپنے خیالوں میں ہی شکاری بنے ہوتے جا رہے تھے۔

ہم گاؤں سے تقریباً تین میل دُور گھنے جنگل میں پہنچ گئے۔ ایک سوٗر نظر آیا۔ ہمارے ہندو دوست نے کہا کہ اس کے پیچھے کُتوں کو چھوڑتے ہیں۔ ایک مسلمان دوست نے کہا کہ یہ ناپاک جانور ہے۔ ہمارے کُتوں نے اُسے مُنہ ڈالا تو کُتے ناپاک ہوجائیں گے۔ اس مسئلے پر بات چیت ہو ہی رہی تھی کہ سوٗر نے ہمیں دیکھ لیا اور پلک جھپکتے جنگل میں غائب ہوگیا۔

ذرا اور آگے گئے تو خرگوشوں کا ایک جوڑا پھُدکتا ہُوا دیکھا۔ ہم نے کُتوں کے پٹوں سے زنجیریں نکال دیں۔ جیسا کہ میں عرض کرچکا ہوں نہ ہم میں شکار کا شعور تھا نہ ہمارے کُتے کبھی شکار کھیلے تھے اور ہم یہ بھی فراموش کئے بیٹھے تھے کہ کُتا کُتے کا بیری ہوتا ہے۔ ہم سب کُتوں کو تھپکیاں دیتے اور اُن کی توجہ خرگوشوں کی طرف مبذول کرتے تھے لیکن وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے اور ہماری کوششوں پر پانی پھیرتے جارہے تھے۔

آخر ایک کُتے نے خرگوشوں کو دیکھ لیا اور وہ اُس طرف دوڑا نہیں بلکہ منہ اٹھا کر اور کان کھڑے کرکے روانہ ہوگیا۔ اُسے دیکھ کر ایک اور کُتا اُس کے پیچھے پیچھے چل پڑا پھر دونوں کی رفتار ذرا بڑھ گئی۔ خرگوشوں نے ابھی اس طرف نہیں دیکھا تھا۔ وہ دونوں کُتے ذرا اور تیز رفتار سے بڑھے جارہے تھے۔ ایک بھونک پڑا۔ اُس کی آواز پر خرگوشوں نے اُدھر دیکھا اور بھاگ اُٹھے۔ جب وہ بھاگے تو آگے جانے والے دونوں کُتے اُن کی طرف دوڑ پڑے۔ خرگوشوں کو ان کُتوں سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ کہیں غائب ہوگئے تھے۔ کُتوں کو بھی غالباً احساس تھا کہ وہ خرگوشوں کے لئے خطرہ نہیں بن سکتے۔ وہ صرف یہ ظاہر کرنے کے لئے دوڑے تھے کہ وہ کُتے ہیں۔ کُتوں کا دوڑنا محض ایک سیاسی چال تھی۔

وہ دونوں کُتے دوڑ کر اُس جگہ پہنچ گئے جہاں خرگوش تھے اور کبھی مُنہ نیچے کرکے زمین کو سُونگھتے اور پھر مُنہ اُوپر کرکے بھونکتے۔ بُلڈاگ نے اُن کی آوازیں سُنیں تو وہ انتہائی تیز رفتار سے دوڑا اور اُن کُتوں میں سے ایک پر جھپٹ پڑا۔ دوسرا کُتا بھی اچھی نسل کا تھا۔ وہ مقابلے میں ڈٹ گیا لیکن بُلڈاگ

زیادہ طاقتور اور جنگجو تھا۔ اس کا پلڑہ بھاری رہا۔

دوسرے دونوں کتوں نے جب دیکھا کہ بلڈاگ سے لڑنے والا کتا کمزور ہے تو وہ دونوں بھی اس کتے پر ٹوٹ پڑے۔ بلڈاگ نے اسے چھوڑ کر دوسرے دونوں کتوں میں سے ایک کی گردن منہ میں لے لی پھر ہمارے لئے یہ معلوم کرنا محال ہوگیا کہ کون سا کتا کس کے ساتھ لڑ رہا ہے۔ ہم ہنس ہنس کر بے حال ہوتے جا رہے تھے اور کتے جنگ و جدل میں مصروف تھے۔

انہیں ٹانگوں سے پکڑ کر اور گھسیٹ گھسیٹ کر الگ کیا پھر انہیں زنجیریں ڈال دیں لیکن وہ ایک دوسرے کو معاف کرنے پر آمادہ نظر نہیں آتے تھے۔ ایک دوسرے پر غراتے اور بھونکتے تھے۔ ہم نے انہیں ایک دوسرے سے دُور دُور رکھا۔

وہاں سے علاقہ دشوار گزار اور خوفناک سا شروع ہوگیا تھا۔ پہاڑیاں اور چٹانیں تو آپ نے بہت دیکھی ہوں گی۔ اس علاقے میں بھی چٹانیں تھیں جن پر کسی ہزاروں سال پرانے قلعے کی دیواروں یا کھنڈروں کا گمان ہوتا تھا۔ بظاہر یہ سیمنٹ کی طرح سخت لگتی تھیں لیکن ان کی ڈھلانوں پر اُوپر اُوپر کہیں کہیں درخت تھے۔ یہ سب چٹانیں کہیں کہیں سے دیواروں کی طرح سیدھی اُوپر چلی گئی تھیں۔ ان کے درمیان زمین پر گھنے درخت اور گھنی جھاڑیاں تھیں۔ یہ چٹانیں کہیں کہیں سے اتنی پھٹی ہوتی تھیں کہ ان کے درمیان سے ایک گھوڑا آسانی سے گزر جاتا تھا۔

ہم نے ایسی ایک جگہ دیکھی تھی جہاں سے چٹان کٹی ہوتی تھی۔ ایک گلی سی بنی ہوتی تھی۔ ہم تھوڑی دُور تک آگے گئے پھر واپس آگئے۔ ایسے ڈر آتا تھا جیسے یہ بڑے خوفناک درندوں کے چھپنے کی جگہ ہو۔ وہاں سے ہم اور آگے گئے تو دو کتے دکھائی دیئے جو کچھ کھا رہے تھے۔ اُس وقت ہم ذرا بلند جگہ پر تھے۔ ہمارے ایک دوست نے کہا کہ کتوں سے کتوں کا ہی شکار ہو جاتے۔ ہم بلندی سے نیچے اُترے۔ بیس پچیس قدم اور آگے گئے تو اُن دونوں کتوں نے ہماری طرف دیکھا، اور دونوں غراتے تب ہمیں ہوش آئی کہ یہ تو بھیڑیے

ہیں۔ وہ غالباً اپنا شکار مار کر کھا رہے تھے۔ ہمارے کُتوں نے بھی انہیں دیکھ لیا اور غرّانے لگے۔ ہم نے چاروں کُتوں کی زنجیریں کھول دیں۔ کُتے اُن کی طرف پوری رفتار سے دوڑے۔ ہمیں توقع تھی کہ بھیڑیے مقابلے میں ڈٹ جائیں گے لیکن بھیڑیے بھاگ اُٹھے۔ کُتے انہیں پکڑنے کے لئے اور تیز دوڑنے لگے اور پھر بھیڑیے بھی اور کُتے بھی ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

ہمارے دو دوست دونوں گھوڑیوں پر سوار ہو گئے اور اپنے کُتوں کے پیچھے گئے۔ جو دوست پیدل تھے وہ آرام آرام سے چلتے گئے۔ ہمارے سوار دوست بھی ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ ہم چاروں تھک کر ایک جگہ بیٹھ گئے۔

بہت دیر بعد ہمارے دوست واپس آ گئے۔ اُن کے ساتھ چار کی بجائے تین کُتے تھے۔ بُلڈاگ اُن کے ساتھ نہیں تھا۔ دوستوں نے بتایا کہ تلاش بسیار کے باوجود بُلڈاگ کہیں نظر نہیں آیا۔ یہ تو قیمتی کُتا تھا۔ اُسے ہم ضائع نہیں کر سکتے تھے۔ ہم سب اُس کی تلاش میں آگے چلے گئے۔ آگے علاقہ اور زیادہ خوفناک ہو گیا تھا۔

ہم غالباً ایک میل آگے نکل گئے ہوں گے۔ اچانک ہمیں ایک کُتے کی اس طرح آواز سنائی دی جیسے اُس نے کسی پر حملہ کر کے اُسے پکڑ لیا ہو۔ اُس کے ساتھ ہی ایک آدمی کا واویلا سنائی دیا۔ وہ کُتے کو دھتکار رہا تھا اور گالیاں بھی بک رہا تھا۔ آواز دُور سے نہیں آ ئی تھی۔ ہم اس طرف دوڑے گئے تو ایسا منظر دیکھا جس سے ہمارے دل دہل گئے۔ بُلڈاگ نے ایک آدمی کی ٹانگ مُنہ میں لے رکھی تھی اور اُسے بھنبوڑ رہا تھا۔

ہم گولیوں کی رفتار سے پہنچے اور بُلڈاگ پر قابو پا لیا، لیکن جس کی اُس نے ٹانگ پکڑی تھی اُس کی چیخیں فلک کا جگر چاک کر رہی تھیں۔ کُتا تو اُس سے الگ ہو گیا لیکن اُس کی پنڈلی گوشت کا لوتھڑا بن چکی تھی اور وہ تڑپ رہا تھا۔ اُس کے ساتھ ایک اور آدمی تھا جو کُتے سے اتنا ڈرا کہ اُسے کُتے سے چھڑانہ

سکا اور وہاں سے اِدھر اُدھر ہو گیا۔ کچھ وقت بعد وہ آگیا۔ یہ اُس کا بھی قصور نہ تھا۔ بُلڈاگ تھا ہی بہت خوفناک اور خونخوار کُتا۔

یہاں سے اُس واقعہ کی ابتدا ہوتی جو سنانے کے لئے میں نے اتنی لمبی تمہید باندھی ہے۔ کُتے کے زخمی کئے ہوئے آدمی کی مرہم پٹی کی فوری ضرورت تھی۔ اُس کے ساتھی نے اپنے کندھوں پر تہہ کی ہوئی ایک چادر ڈال رکھی تھی۔ اُس نے اس چادر کے کنارے سے چار پانچ اِنچ چوڑی پٹی پھاڑی اور زخمی کی پنڈلی پر لپیٹ کر مضبوط گانٹھ دے دی۔ زخم دیکھا نہیں جاتا تھا۔

اِن دونوں نے آپس میں کھُسر پھُسر شروع کر دی۔ اُن کی بیشتر باتیں ہم نہ سمجھ سکے کیونکہ وہ سرگوشیاں کر رہے تھے اور اس لئے بھی کہ وہ ٹھیٹھ دیہاتی زبان بول رہے تھے۔ میں جو سمجھ سکا وہ یہ تھا کہ زخمی بہت تکلیف میں تھا اور زخم کو دیکھ کر اُس کا حوصلہ ٹوٹ گیا تھا۔ ان دونوں کا گاؤں دُور تھا۔ زخمی کسی قریبی گاؤں میں جا کر مرہم پٹی کرانا چاہتا تھا اور اُس کا ساتھی اُسے روک رہا تھا۔ میں نے زخمی کے یہ الفاظ اچھی طرح سُنے کہ اس علاقے میں مجھے کوئی نہیں پہچانتا۔ تم چلے جاؤ، میں اِن کے ساتھ چلا جاؤں گا۔ اِن دونوں کی بحث میں گرماگرمی بھی پیدا ہو گئی تھی۔

"میرے دوستو!" ــــ زخمی نے ہمیں کہا ــــ "تمہارے کُتے نے مجھے کاٹا ہے۔ میں تم سے تاوان تو نہیں مانگتا۔ مجھ پر کرم کرو۔ مجھے گھوڑی پر بٹھا کر میرے گاؤں چھوڑ آؤ۔ میرا گاؤں دُور ہے۔ اگر تمہارے گاؤں قریب ہیں تو مجھے اپنے گاؤں لے چلو۔ خون بند نہیں ہو رہا ... تمہارا گاؤں کون سا ہے؟"

اُسے اپنے گاؤں کا نام بتایا تو اُس نے کہا کہ یہ تو چار میل بھی نہیں ہوگا۔ اُس کا گاؤں وہاں سے سات آٹھ میل دُور تھا۔ ہم سب دوستوں نے فیصلہ کیا کہ اسے اپنے گاؤں لے چلتے ہیں۔ وہ بے چارہ بہت بُری حالت میں تھا۔ اُس کی ٹانگ پر اتنی بڑی جو پٹی باندھی گئی تھی اُس کا رنگ گہرا سُرخ ہو گیا تھا۔ اُس کا خون جلدی بند ہونا چاہیئے تھا۔

اُسے ایک گھوڑی پر سوار کیا۔ دوسری گھوڑی صوبیدار کے بیٹے کی تھی۔ ہم

نے اُسے کہا کہ وہ اپنی گھوڑی پر زخمی کے ساتھ جاتے اور دونوں گھوڑیاں دوڑاتے ہوتے جائیں ہمیں پیدل جانا تھا۔ اگر ہم انہیں اپنے ساتھ رکھتے تو گاؤں میں ڈیڑھ گھنٹے میں پہنچتے۔ اُن دونوں نے گھوڑیاں دوڑا دیں۔

ہم گاؤں میں پہنچے اور صوبیدار کے گھر گئے۔ گاؤں کا جراح جو ہندو تھا، زخمی کی مرہم پٹی کر چکا تھا۔ یہ ہماری نوجوانی کے وقت کی دیسی یا غیر سائنسی جراحی تھی۔ ایسی ایسی دیسی دوائیاں ہُوا کرتی تھیں جو خون جلدی روک دیتیں اور زخم کو جلدی مندمل کر دیتی تھیں۔

رات کو زخمی صوبیدار کے گھر رہا۔ اگلا دن بھی وہیں رہا۔ اگلی رات بھی اُسے وہیں رہنا تھا۔ صوبیدار کے بیٹے نے ہمیں بتایا تھا کہ زخمی جس کی عمر تیس اور پینتیس سال کے درمیان تھی اپنے گاؤں جانے کو کہہ رہا تھا لیکن صوبیدار اُسے جانے نہیں دے رہا تھا۔ کہتا تھا کہ جب تک اُس کا زخم ٹھیک نہیں ہو جاتا وہ اُسے نہیں جانے دے گا۔

رات کے نو بجے ہوں گے۔ دیہات کے لوگ جلدی سو جایا کرتے تھے۔ میں دو دوستوں کے ساتھ اپنی ڈیوڑھی میں بیٹھا تھا۔ ہمارا معمول تھا کہ رات کو ہم دوست کسی دوست کے گھر اکٹھے ہو جاتے اور گپیں ہانکتے یا تاش کھیلا کرتے تھے۔ اسی معمول کے مطابق اُس رات میرے دوست میری ڈیوڑھی میں آ گئے تھے۔ ڈیوڑھی کا باہر والا دروازہ کھلا ہُوا تھا اور باہر اندھیرا تھا۔

سات آٹھ آدمی اکٹھے گزر گئے۔ گاؤں میں ایک آدمی نے ڈیوڑھی کے دروازے میں آ کر کہا کہ پولیس آتی ہے اور صوبیدار کے گھر جا رہی ہے۔ ہم باہر نکلے اور بڑی تیز تیز صوبیدار کے گھر کی طرف چلے گئے۔ صوبیدار کے صحن میں لالٹین کی روشنی تھی اور اندر سے باتوں کی آوازیں آتی سنائی دے رہی تھیں۔ ہم باہر کھڑے رہے۔ دو پولیس کانسٹیبل باہر کھڑے تھے۔ گاؤں تو ہمارا بڑا تھا لیکن پولیس سٹیشن ایک اور گاؤں میں تھا جو ڈیڑھ میل دُور تھا۔ آزادی کے بعد جب ہمارا گاؤں قصبے جتنا بڑا ہو گیا تو پولیس سٹیشن ہمارے ہاں بن گیا تھا۔

کچھ منٹ گزرے ہوں گے کہ تھانیدار باہر آیا۔ ایک آدمی کے ہاتھ میں

لالٹین بھی۔ تھانیدار کے پیچھے زخمی مہمان ہتھکڑی میں بندھا ہوا باہر آیا۔ پولیس زخمی کو لے گئی۔ صوبیدار بھی ساتھ ہی گیا اور میری یہ حالت کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ ہُوا کیا؟ کیا زخمی نے صوبیدار کے گھر میں کوئی بدمعاشی کی تھی کہ صوبیدار نے اُسے پولیس کے حوالے کر دیا؟ صوبیدار کی ایک جوان بیٹی بھی تھی۔ میرا دھیان اُس کی طرف چلا گیا۔

صوبیدار کا بیٹا جو ہمارا دوست تھا، وہ پولیس کے ساتھ نہ گیا۔ اُس نے میرے تمام سوالوں کے جواب دے دیئے۔ زخمی اشتہاری ملزم تھا۔ اُس کا پیشہ ڈکیتی اور رہزنی تھا۔ وہ دوسرے پولیس سٹیشن کے علاقے کا تھا اور ڈکیتی کی ایک یا ایک سے زیادہ وارداتوں میں مطلوب تھا۔ وہ کوئی مشہور ڈاکو نہیں تھا جیسے اُس وقت ہُوا کرتے تھے۔ اس لئے اُس کے علاقے سے باہر اُسے کوئی نہیں پہچانتا تھا۔

صوبیدار چونکہ ریٹائر ہو گیا تھا اس لئے فراغت کی گھڑیاں یوں گزارتا کہ کھیتوں کی دیکھ بھال کرتا اور پولیس سٹیشن بھی چلا جاتا تھا۔ اُس نے تھانیدار کے ساتھ دوستی گانٹھ لی تھی۔ ظاہر تھا کہ وہ مخبری بھی کرتا تھا۔ زخمی چونکہ اشتہاری ملزم تھا اس لئے مختلف پولیس سٹیشنوں میں اُس کی تصویر موجود تھی۔ مفرور ملزموں کی پاسپورٹ سائز تصویریں پولیس سٹیشنوں میں دیوار کے ساتھ لگا دی جاتی تھیں۔ صوبیدار پولیس سٹیشن جاتا رہتا تھا۔ اُس نے وہاں مفرور ملزموں کی تصویریں دیکھی تھیں جو وہ ہر روز دیکھتا ہو گا کیونکہ وہ تھانیدار کے دفتر میں لگی ہوتی تھیں۔

زخمی کا نام احسان الحق تھا اور حقا پکارا جاتا تھا یعنی وہ احسان الحق عرف حقا تھا۔ صوبیدار نے اتفاق سے اُس کی تصویر پولیس سٹیشن میں دیکھی تو شک نہیں بلکہ اُسے یقین ہو گیا کہ یہ اُس کے زخمی مہمان کی تصویر ہے۔ صوبیدار نے اپنے بیٹے کے ساتھ بات کی۔ بیٹے نے اُسے بتایا کہ جب ہم چھ دوستوں نے اسے زخمی حالت میں دیکھا تھا تو اُس نے اپنے ساتھی کے ساتھ باتیں کی تھیں۔ اس کا ساتھی اسے ہمارے ساتھ آنے سے روک رہا تھا اور حقا نے کہا تھا کہ اس علاقے میں اسے کوئی نہیں پہچانتا۔ اُس وقت ہمیں تو ذرا بھی خیال نہیں آیا

تھا کہ عادی مجرم اور مفرور ہے۔ صوبیدار جہاندیدہ آدمی تھا۔ اُسے یقین ہو گیا کہ یہ وہی شخص ہے جس کی تصویر پولیس سٹیشن میں ہے۔

"احسان الحق!" — صوبیدار نے اُسے کہا — "تم نے مجھے اپنا نام صحیح بتایا ہے۔ اب یہ بتادو کہ تم عرف حقا ہو؟"

"آپ کو کیسے سراغ ملا؟" — حقا نے پوچھا۔

"پولیس سٹیشن میں تمہاری تصویر موجود ہے" — صوبیدار نے کہا۔

"صوبیدار صاحب!" — حقا نے کہا — "آپ نے ٹھیک پہچانا ہے۔ میں یہاں کبھی نہ آتا لیکن آپ نے میری ٹانگ کی حالت دیکھی ہے۔ اگر میں اپنے گاؤں کو روانہ ہو جاتا تو راستے میں ہی میرا جسم خون سے خالی ہو جاتا اور میں مر جاتا۔ آپ کا گاؤں قریب تھا اور گھوڑی بھی تھی۔ آپ نے مجھے مہمان ٹھہرایا اور علاج کا بندوبست کیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ آپ کو کیا صلہ پیش کروں گا۔ اب میری اصلیت بے نقاب ہو گئی ہے تو میں آپ سے گزارش کرنا چاہوں گا کہ پولیس کو اطلاع نہ دے دینا۔ میں اتنا زیادہ مشہور اور خطرناک ڈاکو نہیں کہ میری گرفتاری کا انعام مقرر ہو گا۔ میں ایک واردات میں گرفتار ہو گیا تھا اور میں تھانے سے فرار ہو گیا تھا۔"

"کیا تم پہلی بار گرفتار ہوتے تھے؟" — صوبیدار نے پوچھا۔

"تین بار!" — اُس نے جواب دیا — "پہلی بار دو سال سزائے قید ہوئی تھی۔ دوسری بار جرم ثابت نہ ہونے کی وجہ سے بری ہو گیا اور اب تیسری بار فرار ہو گیا تھا" — اُس نے اُس پولیس سٹیشن کا نام بتا دیا جہاں سے وہ فرار ہوا تھا پھر کہنے لگا — "میں عرض کر رہا تھا کہ مجھے گرفتار کرانے کے لئے پولیس کو اطلاع نہ دینا"

"اطلاع دے دوں گا تو کیا ہو گا؟" — صوبیدار نے پوچھا۔

"آپ کے لئے اچھا نہیں ہو گا" — حقا نے کہا — "میں تو گرفتار ہو جاؤں گا لیکن میرے ساتھی آپ سے انتقام لیں گے جو بہت بُرا ہو گا۔ میں صرف دو دن اور یہاں رہوں گا۔ میرا ذکر کسی کے ساتھ نہ ہو ورنہ صرف آپ کے لئے نہیں بلکہ

آپ کے اس گھر کے لئے بھی اچھا نہیں ہوگا۔"

اُس نے صوبیدار کو کچھ اور بھی دھمکیاں دیں جن سے اُس کا مدعا اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ صوبے دار ڈر جاتے اور اُس کی موجودگی کی اطلاع پولیس سٹیشن میں نہ کر دے۔ صوبیدار کوئی ہندو بنیا تو نہیں تھا کہ ڈر جاتا۔ وہ صوبیدار تھا اور مسلمان تھا۔ ایک سال پہلے وہ ریٹائر ہو کر آیا تھا اور اُس نے برما فرنٹ پر جنگِ عظیم لڑی تھی۔ اُس نے حقّا کو اطمینان دلایا کہ وہ جتنا عرصہ چاہے اُس کے گھر میں رہے، پولیس کو پتہ نہیں چلنے دیا جائے گا لیکن صوبیدار نے تھانیدار کو جا اطلاع دی کہ اشتہاری ملزم حقّا اُس گھر میں ہے چنانچہ رات کو پولیس آئی اور اُسے پکڑ کر لے گئی۔

"میں اُسے گرفتار نہ کراتا" ــــ صوبیدار گاؤں کے چند ایک آدمیوں کو دوسرے دن سنا رہا تھا ــــ "وہ ڈاکو تھا، رہزن تھا یا کوئی بھی تھا، وہ میرا مہمان تھا اور زخمی تھا۔ میں نے انگریز کے قانون کا اتنا احترام نہیں کرنا تھا کہ اپنے زخمی مہمان کو پولیس کے حوالے کر دیتا لیکن اس بدقسمت آدمی نے مجھے دھمکیاں دیں اور ڈرایا۔ اس پر وہ فخر کرتا تھا کہ وہ دھونس سے میرے گھر میں رہ رہا ہے۔

"میں نے اُس سے پوچھا کہ اب وہ کس جرم میں گرفتار ہوا تھا تو اس نے رہزنی کی واردات بتائی۔ ایک جوان لڑکی اپنے باپ اور ماں کے ساتھ جا رہی تھی۔ اس بدبخت نے انہیں روک لیا۔ ان کے پاس جو رقم تھی وہ لے لی اور لڑکی کی آبروریزی بھی کی۔ لڑکی کے باپ نے اُسے پہچان لیا اور یہ خبیث پکڑا گیا مگر پولیس سٹیشن سے فرار ہو گیا۔ میں اس کا یہ گناہ معاف نہیں کر سکتا۔ ڈاکو اور رہزن عورتوں کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کیا کرتے۔"

حقّا نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ بلڈاگ نے اُسے کاٹا کیوں تھا۔ حقّا اپنے ایک ساتھی کے ساتھ وہاں بیٹھا ہُوا تھا۔ اُس نے یہ نہیں بتایا کہ وہ چھپا ہُوا تھا یا رہزنی کے لئے کسی شکار کی راہ دیکھ رہا تھا۔ بلڈاگ دوسرے کتوں کے ساتھ بھیڑیوں کے پیچھے گیا تھا۔ بھیڑیے تو نکل گئے تھے اور کُتّے ویسے ہی اِدھر اُدھر سونگھتے

پھرتے تھے۔ بُلڈاگ اُدھر جا نکلا جہاں حقا بیٹھا تھا۔ اُس نے بُلڈاگ کو پچکارا۔ اُسے یہ کُتا پسند آگیا تھا اور اُس نے اس کُتّے کو اپنے ساتھ لے جانے کا ارادہ کر لیا تھا۔

بُلڈاگ اُس کے قریب چلا گیا۔ اس نے کُتّے کو پکڑ لیا اُسے خیال آیا کہ کُتا بھونکے گا تو اس کے مالک اِدھر آجائیں گے۔ چنانچہ اُس نے کُتّے کے مُنہ کو ایک کپڑے سے باندھنے کی کوشش کی مگر بُلڈاگ اتنا بے غیرت دار کُتا نہیں تھا۔ اُس نے مُنہ چھڑا لیا۔ حقا اور اُس کے ساتھی نے اُس پر قابو پانے کی کوشش کی تو بُلڈاگ کو غصہ آگیا۔ اُس کے سامنے حقا تھا۔ اُس نے حقا کی ٹانگ مُنہ میں لے کر چبا ڈالی۔ اگر ہم نہ پہنچ جاتے تو بُلڈاگ حقا کو زندہ نہ چھوڑتا۔

حقا گرفتار ہو گیا۔ چونکہ اُس کی ٹانگ شدید زخمی تھی اس لئے اسے قریبی قصبے کے سول ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا تھا۔ دو تین روز بعد خبر آئی کہ حقا ہسپتال سے بھاگ گیا ہے۔ اُس وقت ہسپتالوں کی یہ کیفیت نہیں ہوتی تھی کہ مریضوں کو برآمدوں میں بھی جگہ نہیں ملتی۔ اُن وقتوں میں تو پورے وارڈ میں چند ایک ہی مریض ہُوا کرتے تھے۔ باقی سب بیڈ خالی ہوتے تھے۔ حقا ہسپتال میں بھی زیرِ حراست تھا۔ دو کانسٹیبل اُس کے ساتھ رہتے تھے۔ چونکہ وہ مریض تھا اس لئے اُسے ہتھکڑی نہیں لگائی جاتی تھی۔

کچھ عرصے بعد یہ تفصیل ہم تک پہنچی کہ وہ کس طرح فرار ہُوا تھا۔ رات کا وقت تھا۔ ایک کانسٹیبل ساتھ والے خالی بیڈ پر سویا ہُوا تھا۔ دوسرا کانسٹیبل حقا کے بیڈ کے ساتھ رکھے ہوتے سٹول پر بیٹھا تھا۔ اُس کے پاس رائفل تھی۔ اُسے تین گھنٹے جاگ کر ڈیوٹی دینی تھی۔ نصف شب کے بعد ڈیوٹی والا کانسٹیبل بیٹھے بیٹھے سو گیا۔ اُس نے سر سے پگڑی اُتار کر سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی تھی۔ اُس زمانے میں پولیس والے کلاہ پر خالی پگڑی باندھتے تھے۔ کانسٹیبل چونکہ سو گیا تھا اس لئے اُس کا سر آگے کو جُھک گیا تھا۔ سائیڈ ٹیبل پر شیشے کی بڑی بوتل رکھی تھی جس میں پانی تھا۔ حقا نے یہ بوتل اُٹھا کر کانسٹیبل کے سر پہ ماری۔ کانسٹیبل لڑھک کر فرش پر جا پڑا۔ سر پر اتنے زور کی چوٹ آدمی کو فوراً بے ہوش کر دیتی ہے۔

کانسٹیبل کی بدقسمتی تو یہ ہوئی کہ اُس نے پگڑی اُتار کر رکھ دی تھی۔ اگر اس کے سر پر پگڑی ہوتی تو اُس کا سر محفوظ رہتا۔ پھر حقا اگر اُسے پیٹ میں چاقو گھونپ دیتا تو بھی وہ بے ہوش نہ ہوتا بلکہ حقا پر قابو پالیتا۔

وارڈ میں آٹھ یا نو مریض تھے۔ وہ سب سوئے ہوتے تھے۔ وارڈ میں ہسپتال کے سٹاف کا کوئی آدمی نہیں تھا۔ دوسرا کانسٹیبل گہری نیند سویا ہُوا تھا۔ حقا نے کانسٹیبل کے سر پر بوتل ماری اور وارڈ سے نکل گیا حالانکہ اس کی ٹانگ زخمی تھی۔ ہسپتال کی مرہم پٹی سے ٹانگ اس کے جسم کا بوجھ اُٹھانے کے قابل ہو گئی ہوگی۔ دوسرے کانسٹیبل کا بیان تھا کہ وہ جاگ اُٹھا تھا اور باہر نکل گیا تھا لیکن باہر اندھیرا تھا۔ وہ ہسپتال کے گیٹ تک گیا لیکن حقا کا سراغ نہ ملا۔

اس سے زیادہ مجھے معلوم نہیں کہ وہ کس طرح اتنی جلدی قصبے سے بھی نکل گیا۔ ہوسکتا ہے اپنے کسی جاسوس کی خفیہ مدد سے وہ فرار ہُوا ہو۔ مجھے اتنا ہی یاد ہے کہ وہ غائب ہو گیا تھا۔ پولیس اُسے تلاش کرتی رہی ہوگی۔ مفرور تو وہ پہلے ہی تھا۔ میں پولیس کی ان سرگرمیوں سے واقف نہیں۔ صوبیدار سے کبھی کبھی اتنی ہی خبر ملتی تھی کہ حقا ابھی تک مفرور ہے۔ صوبیدار کو بھی کچھ پتہ نہ چل سکتا تھا کیونکہ حقا دوسرے تھانے کا ملزم تھا۔

کم و بیش بیس دن گزرے ہوں گے، صوبیدار کے گھر سے شور اُٹھا۔ وقت نصف شب کا ہوگا۔ میں بھی اُن لوگوں میں تھا جو شور اور پکار سن کر فوراً پہنچے تھے۔ صوبیدار کے گھر کے اندر سے دھواں اُٹھ رہا تھا۔ باہر کا دروازہ کھلا تھا۔ ہم لوگ اندر گئے تو صوبیدار سمیت گھر کے تمام افراد اس حالت میں ڈیوڑھی میں فرش پر پڑے تھے کہ اُن کے ہاتھ ایک ہی لمبی رسّی سے پیٹھوں کے پیچھے بندھے ہوتے تھے اور ایک ہی رسّی سے سب کے پاؤں بھی بندھے ہوتے تھے۔ دو تین آدمیوں نے انہیں کھولا۔ باقی سب اندر گئے۔ ایک کمرے میں آگ لگی ہوئی تھی۔ لوگوں نے گھڑوں اور بالٹیوں وغیرہ میں پانی لا کر کمرے کے اندر پھینکا اور آگ پر قابو پالیا۔

صوبیدار نے بتایا کہ یہ واردات حقا لے کی ہے۔ اُس کے ساتھ چار آدمی

تھے۔ وہ دیوار پھاند کر آتے اور صوبیدار اور اُس کے دونوں بیٹوں کو جگایا۔ اُن کے ہاتھوں میں تلواریں اور خنجر تھے۔ گھر کے مرد کچھ نہ کر سکے۔ ڈاکوؤں نے بہت تیزی سے گھر کے تمام افراد کو ڈیوڑھی میں اکٹھا کر کے باندھ دیا۔ ٹرنکوں کے تالے توڑ کر زیورات اور جو رقم ہاتھ آئی نکالی اور ایک کمرے کو آگ لگا کر نکل گئے۔

"صوبیدار صاحب!" — حقّا نے جاتے جاتے ڈیوڑھی میں رُک کر کہا — "میں حقّا ہوں۔ اب گرفتار کرا کے دیکھو۔"

پولیس کو تو رپورٹ ہونی ہی تھی، وہ ہوتی۔ پولیس آئی اور آپ جانتے ہی ہیں کہ پولیس نے کیا کیا کارروائیاں کی ہوں گی۔ میں آپ کو صوبیدار کا ردِّعمل سناؤں گا۔ صوبیدار کہتا تھا کہ پولیس اپنی کارروائی کرتی رہے، حقّا سے وہ خود انتقام لے گا۔ وہ کہتا تھا کہ حقّا کے گھر کے بچے بچے کو اس کے مکان کے اندر زندہ جلا کر آئے گا۔ اس کے دونوں بیٹے بھی یہی کہتے تھے۔

یہ پتہ چل گیا کہ حقّا فلاں گاؤں کا رہنے والا ہے۔ وہ چھوٹا سا ایک گاؤں تھا۔ صوبیدار نے اپنے دونوں بیٹوں، دو بھتیجوں اور ایک مزارعہ کو تیار کر لیا کہ حقّا کے گاؤں جا کر اس کے گھر پر حملہ کریں گے۔ گاؤں کے دانشمند لوگوں نے اُسے روکا اور کہا کہ وہ بڑا سنگین جرم کرنے جا رہا ہے جس کی سزا پھانسی سے کم نہیں ہو گی، لیکن صوبیدار مان نہیں رہا تھا۔ اس کے بیٹوں کو الگ سمجھایا گیا۔ اُن کی سمجھ میں یہ بات آگئی۔ صوبیدار کو یہ بھی بتایا گیا کہ حقّا ایسا احمق نہیں ہو گا کہ اپنے گھر میں بیٹھا رہتا ہو گا۔

ہمیں صوبیدار سے ہی پتہ چلتا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ معلوم ہُوا کہ وہ چھوٹا سا گاؤں حقّا اور اس کے گروہ کے زیرِ اثر بھی ہے اور اُس سے خوفزدہ بھی۔ اُس گاؤں پر کتنی بار پولیس کا چھاپہ پڑا لیکن حقّا نہ ملا۔ حالانکہ اُس کی موجودگی کی اطلاع پولیس سٹیشن پہنچی تھی۔ صوبیدار نے یہ سراغ بھی لگا لیا تھا کہ اس علاقے کا تھانیدار حقّا سے ماہوار رشوت وصول کرتا ہے ورنہ حقّا میر علی ٹھگ یا سلطانہ ڈاکو نہیں تھا کہ کسی کے ہاتھ ہی نہ آتا۔

صوبیدار کو یاد آگیا کہ ملٹری سروس کے آخری دو سال حقا کے گاؤں کا ایک سپاہی اس کا اردلی رہا تھا۔ صوبیدار نے گاؤں کے ایک آدمی کی زبانی پیغام بھیج کر اس سپاہی کو بلا لیا۔ یہ سپاہی جنگ کے دوران برما فرنٹ پر زخمی ہو گیا تھا۔ دائیں ٹانگ کی ہڈی تین چار جگہوں سے ٹوٹ گئی تھی۔ وہ چل پھر تو سکتا تھا لیکن ملٹری سروس کے قابل نہیں رہا تھا اس لئے اُسے میڈیکل پنشن دے کر گھر بھیج دیا گیا تھا۔ صوبیدار کہتا تھا کہ یہ سپاہی میری ضرور مدد کرے گا۔

وہ سپاہی آگیا۔ میں نے اُسے دیکھا تھا۔ ذرا سا لنگڑا کر چلتا تھا۔ صوبیدار نے اس کے ساتھ معلوم نہیں کیا منصوبہ بنایا، سپاہی اُسی روز واپس چلا گیا۔

پندرہ سولہ دن گزر گئے ہوں گے صوبیدار گاؤں میں نعرے لگاتا پھر رہا تھا ——"حقا پکڑا گیا۔ اُس کی دونوں ٹانگیں توڑ دی گئی ہیں۔"

حقا کے پکڑے جانے کی جو تفصیل بعد میں معلوم ہوئی وہ یوں ہے کہ اس سپاہی نے صوبیدار کو بتایا تھا کہ حقا آٹھویں دسویں روز گاؤں میں آتا ہے اور گاؤں میں کسی کو جرأت نہیں ہوتی کہ اُس کی موجودگی کی اطلاع پولیس کو دے دے۔ ان لوگوں میں یہ سپاہی بھی شامل تھا لیکن اب حقا اپنے گاؤں میں گیا تو اس سپاہی نے رات کو اُسے گھر سے باہر بلایا اور اُسے کہا کہ آج رات کسی وقت پولیس ہیڈ کوارٹر سے پولیس گارد چھاپہ مارنے آرہی ہے۔ مختصر یہ کہ سپاہی اُسے باتوں باتوں میں گاؤں سے کچھ دُور لے گیا اور ایک جگہ لے جا کر اُسے کہا کہ آج رات یہیں گزاریں گے۔

حقا کم عقل آدمی لگتا تھا۔ وہ وہیں بیٹھ گیا۔ وہیں سے ایک اور آدمی اٹھا جو اس سپاہی کا چھوٹا بھائی تھا۔ ان دونوں نے حقا کو پیٹھ کے بل گرا لیا۔ سپاہی نے ایک وزنی پتھر اُٹھایا اور حقا کے دونوں گھٹنوں پر بہت زور زور سے مارا۔ پھر گھٹنوں سے نیچے پتھر کی ضربیں ماریں۔ دونوں ٹانگوں کی ہڈیاں ایسی ٹوٹیں کہ جُڑنے کے قابل نہ رہیں۔ ایک بھائی حقا کے پاس بیٹھا رہا اور دوسرا بھائی جو سابق سپاہی تھا، پولیس سٹیشن چلا گیا اور وہاں اطلاع دی کہ حقا زخمی حالت پڑا ہے۔ معلوم نہیں اُسے کس نے زخمی کیا ہے۔

تھانیدار کے گھر اطلاع دی گئی۔ وہ آ گیا اور سپاہی نے یہی بتایا کہ دونوں بھائی کہیں سے آرہے تھے کہ انہوں نے راستے میں حقا کو بے ہوش پڑا دیکھا۔

"معلوم ہوتا ہے تم دونوں نے اُسے مارا ہے" ـــــ تھانیدار نے کہا

"میری ایک بات غور سے سن لیں جناب!" ـــــ سپاہی نے کہا ـــــ "میں جانتا ہوں آپ حقا کو گرفتار نہیں کرنا چاہتے۔ اس کے ساتھ آپ کی جو دوستی ہے میں اس سے واقف ہوں۔ اس نے میرے صوبیدار صاحب کا گھر لوٹا ہے اور ان کے گھر کو آگ لگائی ہے۔ اگر آپ اُسے اب بھی بچانے کی کوشش کریں گے تو میں سابق فوجی ہوں، سیدھا آپ کے ہیڈ کوارٹر جا رہا ہوں"۔

تھانیدار کو مجبوراً اُس جگہ جانا پڑا جہاں حقا بے ہوش پڑا تھا۔ اُسے اُٹھا کر سول ہسپتال لے گئے۔ اُس نے ہوش میں آکر بیان دیا کہ اُسے اس سپاہی نے اور ایک اور آدمی نے گرا کر پتھر مارے ہیں، لیکن علاقے کا تھانیدار چونکہ خود رشوت خوری کا مجرم تھا اس لئے وہ سپاہی کے خلاف بیان لکھنے سے ڈرتا تھا۔ جنگِ عظیم کے دوران انگریزوں نے فوجیوں کو اتنی زیادہ اہمیت دے دی تھی کہ کوئی بڑا افسر بھی فوج کے معمولی سے سپاہی کے ساتھ بھی احترام سے بات کرتا تھا۔ یہ واقعہ جنگ عظیم کے فوراً بعد کا ہے۔

میں چھوٹی چھوٹی باتوں کو حذف کر رہا ہوں۔ واقعہ یوں ہُوا کہ حقا کی دونوں ٹانگیں بیکار ہو گئیں۔ میں نے سُنا تھا کہ دونوں ٹانگیں کاٹ دی گئی تھیں لیکن یہ مصدقہ خبر نہیں تھی۔ مصدقہ خبر یہ تھی کہ حقا کو دو تین دفعات کے تحت مجموعی طور پر بیالیس برس سزا ہوئی تھی اور وہ ڈیڑھ دو سال بعد جیل میں مر گیا تھا۔

کچھ عرصہ بعد کچھ اور باتوں سے پردہ اٹھا جن میں اہم بات یہ تھی کہ اس سپاہی نے ایسی بے خوفی کا مظاہرہ کیوں کیا کہ یہ جانتے ہوتے کہ تھانیدار اور گاؤں کی تمام آبادی حقا کو بچا رہی ہے، اُس نے اپنے بھائی کو ساتھ لے کر حقا کی ہڈیاں توڑ کر اُسے گرفتار کرا دیا۔

اس سوال کا جواب یہ ملا کہ یہ صوبیدار اپنی پلٹن کے ساتھ برما فرنٹ پر تھا اور یہ سپاہی اس کا اردلی تھا۔ اُس وقت جاپانی انگریزوں کی فوج پر غالب آئے ہوتے تھے۔ ایک حملے میں صوبیدار کی پلٹن کو جاپانیوں کے دباؤ کے تحت بھاگنا پڑا۔ یہ بھاگنا ویسے ہی تھا جیسے کہا کرتے ہیں کہ سر پر پاؤں رکھ کے بھاگے۔ اس سپاہی کی دائیں ٹانگ میں سے مشین گن کی تین چار گولیاں گزر گئی تھیں جنہوں نے ہڈی کو دو تین جگہوں سے توڑ دیا تھا۔ کسی کو اتنی فرصت نہیں تھی کہ زخمیوں کو اُٹھا لاتے۔ سپاہی مشین گنیں وغیرہ پھینک کر بھاگ گئے تھے۔ صوبیدار نے اپنے اردلی کی وفاداری کا یہ صلہ دیا کہ اپنی جان کی پرواہ نہ کی اور اردلی کو کندھوں پر اٹھا کر پیچھے لے آیا تھا۔ وہاں سے اُسے کلکتہ بھیج دیا گیا جہاں اس کی ٹانگ جڑ گئی اور میڈیکل پنشن بھی مل گئی۔ اگر وہ مورچے میں ہی پڑا رہتا تو موت کے سوا اسے کوئی پناہ نہ دیتا۔

اب صوبیدار کے گھر حقا کی واردات کے بعد صوبیدار کو اپنا یہ سابق اردلی یاد آیا تو صوبیدار نے اُسے بلایا۔ صوبیدار نے اُسے کہا تھا کہ وہ اتنا سا کام کرے کہ حقا جس رات گاؤں ہو وہ صوبیدار کے گاؤں آکر اُسے بتا دے۔ یہ ذہن میں رکھیں کہ حقا کا گاؤں وہاں سے دس میل سے کچھ زیادہ ہی تھا۔ سپاہی نے صوبیدار سے پوچھا تھا کہ وہ کیا کرے گا۔ صوبیدار نے اُسے بتایا تھا کہ حقا سمیت اُس کے گھر کے تمام افراد کو زندہ جلا دے گا لیکن سپاہی نے خود حقا کو گرفتار کروا دیا۔

"صوبیدار صاحب!" — سپاہی نے حقا کی گرفتاری کے بعد صوبیدار سے کہا تھا — "اگر آپ اس طرح انتقام لینے کے لئے آتے جس طرح آپ کہہ رہے ہیں تو اس طرح سے خود آپ کو نقصان پہنچ سکتا تھا۔ آپ کسی کے گھر پر حملہ کرنے اور آگ لگانے کے جرم میں گرفتار بھی ہو سکتے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو حقا کے آدمی پھر آپ پر انتقامی وار کرتے۔ آپ باعزت سردار ہیں۔ میں نے آپ کی عزت برقرار رکھنے کا یہ طریقہ بہتر سمجھا کہ حقا سے آپ کا انتقام بھی لے لوں اور اُسے گرفتار بھی کرا دوں۔ وہ میں نے کر دیا ہے۔"

انوکھی شادی

بارش اُس روز اچانک ہی شروع ہو گئی تھی۔ دوپہر تک تو لوگ گرمی سے تڑپتے رہے اور پھر اچانک کالی گھٹا چھا گئی اور اس کے ساتھ ہی مُوسلادھار بارش شروع ہو گئی۔ میں اُس وقت دفتر سے نکل چکا تھا۔ پہلے تو سوچا کہ واپس دفتر چلا جاؤں اور بارش رُکنے کا انتظار کروں لیکن بعد میں خیال آیا کہ اتنے عرصے بعد بارش ہوئی ہے، برستی بارش میں گاڑی چلا کر موسم کا مزہ لوٹنا چاہیئے۔

بارش بغیر کسی اعلانِ جنگ کے شروع ہو گئی تھی اس لئے راہ چلتے مسافروں کو بہت پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ بہت سے لوگ بس سٹاپوں کے چھپر تلے پناہ لے کر کھڑے ہو گئے تھے اور بارش رُکنے کا انتظار کر رہے تھے۔ میں گاڑی چلا رہا تھا کہ میں نے ایک عورت کو دیکھا۔ درخت کے نیچے پناہ لئے کھڑی تھی اور بھیگنے سے بچنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ میں نے گاڑی آہستہ کر دی۔ اُس کی صورت کچھ شناسا سی لگی اور میں نے گاڑی اُس کے پاس جا کر روک دی۔ گاڑی رُکی تو اُس عورت نے غور سے میری طرف دیکھا اور جب اُسے یقین ہو گیا کہ میں شکل و صورت سے شریف آدمی لگتا ہوں تو وہ میری گاڑی میں بیٹھ گئی۔ میں نے گاڑی چلا کر اُس سے اُس کی منزل کا پتہ پوچھا۔ اُس نے بتا دیا۔ مجھے اطمینان ہُوا کہ وہ بھی اسی علاقے میں جا رہی تھی جہاں میرا گھر تھا۔

"آپ کی صورت کچھ جانی پہچانی سی لگتی ہے" ــــ میں نے گفتگو کا سلسلہ شروع کرتے ہوئے کہا ــــ "اگر آپ کو پہچاننے میں غلطی نہیں کر رہا تو آپ

کا نام شہناز ہے۔"

اُس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

"آپ مجھے کس طرح جانتے ہیں؟" — اُس نے حیران ہو کر پوچھا۔ اُس کی نظروں میں پریشانی صاف جھلک رہی تھی۔ اُسے پریشان ہونا بھی چاہیئے تھا۔ ایک ایسا آدمی اُس کا واقف بن رہا تھا جس سے وہ پہلے کبھی نہیں ملی تھی۔

"آپ کا میاں میرا بچپن کا یار ہے" — میں نے کہا اور اُس نے اطمینان کا سانس لیا۔

میں نے اُسے غور سے دیکھا۔ اُس کی عمر اب چالیس سال سے تجاوز کر گئی تھی لیکن اُس میں ابھی تک وہی کشش تھی جو آج سے بیس سال پہلے ہُوا کرتی تھی۔ مجھے وہ دَور یاد آ رہا تھا جب شہناز کالج میں زیرِ تعلیم تھی۔ اُن دِنوں وہ بُرقعے میں کالج جایا کرتی تھی لیکن ایک آدھ دفعہ مجھے اُس [illegible] کے دیکھنے کا اتفاق بھی ہُوا تھا۔

مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر وہ جھینپ گئی۔

"آپ مجھے اتنی غور سے کیوں دیکھ رہے ہیں؟" — اُس نے سُرخ ہوتے ہوتے پوچھا۔

"ایک شادی یاد آ رہی ہے" — میں نے جواب دیا — "عجیب و غریب شادی تھی۔ اٹھارہ سال پہلے کی بات ہے۔ اس شادی میں میرا بھی ایک رول تھا۔"

میں نے اُسے ایک کہانی سُنائی جو اُس نے حیرت سے سُنی۔ اس کہانی کے بعض واقعات اُس کے لئے نئے تھے۔ میں ابھی کہانی سُنا ہی رہا تھا کہ اُس کی منزل آ گئی۔

"میں آج کل اپنی بہن کے پاس آئی ہوئی ہوں" — شہناز نے مجھے کہا — "بھائیوں کو تو آپ جانتے ہیں۔ وہ تو مجھے پہچانتے بھی نہیں۔ ایک یہ بہن ہے جس کے پاس کبھی کبھار آ جاتی ہوں۔ ساس سُسر تو فوت ہو گئے تھے۔

میرے میاں اکیلے ہیں۔ اُن کا اس شہر میں قریبی رشتہ دار اور کوئی نہیں اس لئے آئی ہوں تو بہن کے پاس رہتی ہوں۔ وہ بھی اگلے ہفتے مجھے لینے آجائیں گے۔ آپ آج نہ ملتے تو بہت خراب ہونا پڑتا۔"

میں نے اُسے کہا کہ اُس کا خاوند آئے تو اُسے لے کر میرے گھر آئے۔ میں نے اُسے گھر کا پتہ بھی دیا۔

ایک ہفتے بعد شہناز اپنے خاوند سمیت میرے گھر آگئی۔ میری بیوی تو نو سال پہلے فوت ہو گئی تھی۔ میری دو بچیاں تھیں۔ دونوں شہناز کے ساتھ مانوس ہو گئیں۔ میں اور اُس کا میاں الگ بیٹھ کر اپنی جوانی اور لڑکپن کی یادوں میں کھو گئے۔ میری اور اُس کی ملاقات تقریباً پندرہ سال بعد ہو رہی تھی۔

"سلیمان بھائی!" ——شہناز نے کمرے میں داخل ہو کر کہا—— "آپ نے اُس روز مجھے نامکمل کہانی سنائی تھی۔ کہانی کا باقی حصہ آج سُنا دیں۔"

"کہانی تو آپ کو آپ کا میاں بھی سُنا دے گا" ——میں نے کہا—— "اور اس کہانی سے آپ خود بھی واقف ہیں۔ میں تو صرف وہ حصہ سنا سکتا ہوں جو مجھ سے متعلق ہے، لیکن میری ایک شرط ہے" ——میں نے شہناز کے میاں سے مخاطب ہو کر کہا—— "میں یہ کہانی حکایت رسالے والوں کو بھیجنا چاہتا ہوں۔ اگر تم لوگ اعتراض نہ کرو تو ...."

"ضرور بھیجو" ——اُس نے میری بات کاٹ کر کہا—— "اور ہمارے نام بھی اصلی لکھنا۔ ہمیں کسی کا کوئی ڈر نہیں۔"

یہ کہانی اُس زمانے کی ہے جب ہمارا شہر شہر کے اندر ہی تھا۔ اس کے باہر ابھی کالونیاں نہیں بنی تھیں۔ لوگ گلی محلوں میں رہتے تھے۔ گلی کا ایک سب کا مشترکہ کنواں ہوتا تھا۔ اُس زمانے میں بردہ فروشی اور بچوں کے اغوا کی وارداتیں نہ ہونے کے برابر تھیں اس لئے گلی کے بچے اپنے اپنے گھروں سے باہر نکل کر اکٹھے کھیلا کرتے تھے۔ لوگوں میں پیار محبت بھی تھا اور کہیں کہیں دشمنی عداوت بھی چلتی تھی۔ شہناز کے ماں باپ بھی اسی گلی میں رہتے تھے۔

ایک روز گلی کے بچے کھیل رہے تھے کہ شہناز کو ایک لڑکے نے

دو تھپڑ مار دیتے۔ لڑکا اُس سے عُمر میں دو تین سال بڑا تھا۔ شہناز کی عمر چھ سات سال تھی اور لڑکا دس سال کا ہوگا۔ کھیل کھیل میں دونوں کی لڑائی ہو گئی۔ شہناز روتی روتی اپنے گھر چلی گئی اور اندر سے اُس کا باپ نکلا اور اُس نے لڑکے کو پکڑ کر بڑی بے دردی سے مارا۔ لڑکے کی ناک سے یا مُنہ سے خُون جاری ہو گیا۔ اُدھر سے لڑکے کا باپ اور اُس کا چچا بھی نکل آتے اور اُنھوں نے شہناز کے باپ کو پہلے گالیاں دیں اور لڑکے کے چچا نے شہناز کے باپ کو پکڑ کر گرا لیا اور اُس کی اتنی پٹائی کی کہ اُس کا سر پھٹ گیا۔ شہناز کا باپ بھاگ کر تھانے چلا گیا۔ گلی میں پولیس آگئی اور تھانے کچہری کا چکر چل پڑا۔ مجھے اس کی تفصیل سنانے کی ضرورت نہیں۔ اتنا سمجھ لیں کہ دونوں گھرانوں میں دشمنی پیدا ہو گئی۔

دونوں خاندان جدی پُشتی اس گلی کے رہنے والے تھے۔ محلّے کے بزرگوں نے ان لوگوں کو شرم دلائی کہ آپس میں صلح کر لیں لیکن دونوں ہی نہ مانے اور دشمنی گہری ہوتی گئی۔ شہناز کے باپ نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ موقع ملتے ہی انتقام لے گا۔ لڑکے کے خاندان والے اپنے بیٹے کا جس کا نام اختر تھا، خاص خیال رکھا کرتے تھے۔

بچوّں کی لڑائی پر بڑوں میں اکثر لڑائیاں ہو جاتی ہیں اور بچے ایک بار پھر لڑائی جھگڑا بھول کر اکٹھے کھیلنے لگتے ہیں لیکن ان دونوں خاندانوں کے بچوّں نے بھی بڑوں کی اس دشمنی کو قبول کر لیا تھا اس لئے وہ آپس میں کبھی نہ کھیلے۔ شہناز کے ماں باپ نے اس کے بعد اُسے کھیلنے کے لئے گھر سے باہر نہ نکلنے دیا۔ وہ سکول باقاعدگی سے جاتی تھی۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد وہ ایک کالج میں داخل ہو گئی۔ ادھر اختر بھی کسی کالج میں پڑھتا تھا۔

شہناز کے باپ نے شہناز کی منگنی کر دی۔ لڑکا کسی دفتر میں کام کرتا تھا۔ منگنی سے تقریباً چھ ماہ بعد منگنی ٹوٹ بھی گئی۔ بعد میں پتہ چلا تھا کہ شہناز نے اُس کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اُس کی ماں نے اُسے مجبور کیا تو اُس نے کہہ دیا کہ وہ نکاح کے وقت انکار کر دے گی۔ ماں باپ اپنی بے عزّتی کے خوف سے خاموش رہے۔ شہناز نے اپنے منگیتر پر الزام لگایا تھا کہ آوارہ ہے۔

"کالج سے نکلتی ہوں تو میرے پیچھے لگ جاتا ہے"۔ شہناز نے اپنی ماں کو بتایا تھا۔ "بڑی بے ہودہ باتیں کرتا ہے۔ کبھی کہتا ہے میرے ساتھ باغ میں چلو۔ کبھی کہتا ہے چلو فلم دیکھنے چلیں۔ میں نے ایک دن دھتکار دیا تو کہنے لگا کہ تم اپنے دشمنوں کے بیٹے اختر سے ملتی ہو۔"

لڑکے سے پوچھا گیا تو اُس نے کہا کہ اُس نے خود اختر کو اس کے پیچھے جاتے دیکھا ہے۔ ماں نے شہناز سے پوچھا تو شہناز نے بتایا کہ میں تو بُرقعے میں ہوتی ہوں، مجھے کیا پتہ میرے آگے پیچھے کون ہوتا ہے۔ پھر ایک دن یہ بھی پتہ چلا کہ شہناز کے منگیتر اور اختر کے درمیان لڑائی بھی ہوتی تھی۔ منگیتر نے اختر سے کہا تھا کہ وہ شہناز کو چھیڑتا ہے اور اُس کے پیچھے جاتا ہے۔ اختر نے منگیتر کی اچھی طرح ٹھکائی بھی کی تھی۔ اس کے بعد شہناز نے خود کہنا شروع کر دیا کہ اُس کا منگیتر اچھے کردار کا مالک نہیں۔

اس طرح شہناز کی منگنی ٹوٹ گئی اور شہناز کالج میں بدستور پڑھتی رہی۔ البتہ اختر غائب ہو گیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ اُس کے باپ نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر اُسے کسی دوسرے شہر میں ملازمت دلا دی تھی۔ شہناز کے باپ نے کہنا شروع کر دیا تھا کہ وہ اختر کو چھوڑے گا نہیں کیونکہ اُس کی وجہ سے اُس کی بیٹی کی منگنی ٹوٹی ہے۔ اختر کے باپ نے بہتری اسی میں سمجھی کہ اُسے شہر سے باہر بھیج دیا۔

ایک گلی میں رہنے والوں کے گھر کے حالات ایک دوسرے سے چھپے ہوئے نہیں ہوتے۔ گھر والے حالات کو لاکھ چھپانے کی کوشش کریں لیکن چار دیواری کے راز چار دیواری سے باہر جنگل کی آگ کی طرح پھیلتے ہیں۔ گلی محلے کی عورتیں جو اعتماد کے قابل سمجھی جاتی ہیں، قومی نشریاتی رابطے پر یہ راز نشر کر دیتی ہیں۔

اسی طرح یہ خبر ایک روز اچانک گلی میں پھیل گئی کہ شہناز گھر سے غائب ہے۔

شہناز اسی گلی میں پیدا ہوئی اور یہیں پل کر جوان ہوئی تھی۔ گلی والوں

کو جب پتہ چلا کہ شہناز غائب ہے تو سب سناٹے میں آ گئے۔ شہناز کے باپ نے ایک دو روز اُسے اِدھر اُدھر تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن وہ نہ ملی۔ وہ بے چارہ تو پاگل ہو گیا تھا۔ جس شخص کی جوان بیٹی گھر سے غائب ہو جائے اُس کا سکون تو ختم ہو ہی جاتا ہے۔ وہ شخص تو ہوش و حواس کا دامن بھی ہاتھ سے چھوڑ دیتا ہے۔ شہناز کے باپ کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کرے۔ آخر محلے کے کچھ لوگوں نے اُسے مشورہ دیا کہ تھانے میں رپٹ درج کرا دے۔ اُس نے تھانے میں رپٹ درج کرا دی اور پولیس کی تفتیش شروع ہو گئی۔ پولیس نے پہلے کچا پرچہ کاٹا تھا۔ صحیح حالات معلوم ہونے کے بعد نامزد ایف آئی آر لکھی جانی تھی۔

پولیس نے سارے حالات معلوم کئے اور سب سے پہلا شک شہناز کے سابق منگیتر پر کیا۔ اپنی جگہ پولیس کا شک بجا تھا۔ شہناز نے اپنے منگیتر سے نہ صرف شادی کرنے سے انکار کیا تھا بلکہ اُسے بُری طرح دھتکار بھی دیا تھا۔ یہ اُن لوگوں کی بہت بڑی بے عزتی تھی۔ پولیس نے سب سے پہلے سابق منگیتر کو پکڑا اور اُس سے پُوچھ گُچھ ہوتی رہی۔ اُس سے تو کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا۔ ہم لوگوں کو صرف اتنا ہی پتہ چلتا رہا کہ سابق منگیتر نے اختر پر الزام عائد کیا ہے کہ اُس نے شہناز کو غائب کیا ہے۔ پولیس دو دن تو تفتیش کرتی رہی۔ آخر اُنہوں نے منگیتر کو بے گناہ سمجھ کر چھوڑ دیا۔ شہناز کے باپ نے پولیس پر زور دیا کہ اختر کے خلاف تفتیش کی جائے کیونکہ اُس نے شہناز کے باپ کو ذلیل کرنے کے لئے شہناز کو زبردستی غائب کرایا ہے۔ اغوا کا پس منظر تو پولیس کے سامنے ہی تھا۔ اختر کے خاندان اور شہناز کے خاندان کی دشمنی پُرانی تھی۔

پولیس نے اختر کے خلاف باقاعدہ ایف آئی آر درج کی اور اختر کے باپ کو بلایا۔ میں آپ کو یہ بتانا بھول گیا ہوں کہ بچوں کے جوان ہونے کے بعد اختر کے باپ نے گلی والا مکان بیچ دیا تھا اور کسی نئی آبادی میں مکان بنا لیا تھا۔ اختر کے باپ نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا۔ پولیس نے اُس سے اختر کا اتہ پتہ پوچھا جو اُس نے بتا دیا۔

اُسی روز شام کے وقت اختر کا باپ تھانے آیا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک

خط تھا جو اُس نے تھانیدار کے آگے رکھ دیا۔ خط اختر کا تھا جو اُس نے اپنے باپ کے نام لکھا تھا۔ اختر نے اپنے خط میں لکھا تھا ــــ "معافی چاہتا ہوں کہ آپ کو پہلے نہ بتا سکا۔ میں نے شہناز کے ساتھ شادی کر لی ہے اور وہ میرے پاس ہے۔ نکاح باقاعدہ گواہوں کی موجودگی میں ہوا ہے اور میں نے ہر قسم کے مقتے سے بچنے کے لئے مجسٹریٹ کے سامنے شہناز کے بیان بھی کرا دیتے ہیں۔ نقل آپ کو بھیج رہا ہوں۔ اگر آپ میری اس کوتاہی کو معاف کر دیں تو میں شہناز کو لے کر آپ کے پاس آجاؤں گا۔ اگر معاف نہیں کریں گے تو نہیں آؤں گا۔"

"معاف تو میں کر ہی دوں گا" ــــ اختر کے باپ نے کہا ــــ "وہ آخر میرا بیٹا ہے۔ میں اس وقت آپ کے پاس کسی اور کام سے آیا ہوں .... میرے بیٹے کی جان خطرے میں ہے۔ اُسے شہناز کا باپ نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا۔ میں صرف یہ عرض کرنے آیا ہوں کہ اُن لوگوں سے نیک چلنی کی ضمانت لیں۔ میں اس کے بعد اپنے بیٹے کو اس شہر میں آنے دوں گا۔"

گلی والوں کو جب علم ہوا کہ شہناز نے اختر سے شادی کر لی ہے تو اُنہیں حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا۔ یہ ایک انوکھی شادی تھی۔ اتنی پرانی اور گہری دشمنی پر شہناز اور اختر نے لکیر پھیر دی تھی۔ یہ دشمنی بھی اُن دونوں کی وجہ سے ہوئی تھی اور اس دشمنی کو بھی ان دونوں نے ہی ختم کیا تھا۔ اس واردات پر پولیس والے بھی حیران تھے۔

زیادہ تفصیل کا مجھے بھی علم نہیں کہ تھانے میں کیا ہوا تھا۔ اتنا پتہ چلا کہ اختر کی ماں اور باپ ایک سنار کے پاس گئے اور زیور خریدا۔ پھر کپڑے خریدے اور مٹھائی کا ایک ٹوکرہ لے کر اُس شہر میں چلے گئے جہاں اختر ملازم تھا۔ اُنہوں نے شہناز کو قبول کر لیا تھا۔ اس کے بعد شہناز اور اختر نے اپنے شہر آنا شروع کر دیا۔ شہناز کو اُس کے باپ اور بھائیوں نے دھتکار دیا۔

اختر میرا گہرا دوست تھا۔ ہم لوگوں نے جب اُس گلی میں مکان لیا اُس وقت دشمنی پکی ہو چکی تھی۔ اختر اور میں نے اکٹھے ہی میٹرک کا امتحان دیا تھا۔ شہناز کے ساتھ اُس کی خفیہ خط و کتابت اُس زمانے میں شروع ہوئی جو دونوں کی محبت

میں بدل گئی اور آخر شہناز نے دشمنی کی زنجیروں کو توڑ دیا۔ ان لوگوں کی شادی کے بعد میری اختر سے ملاقات ہوتی رہی۔ پھر میں ملک سے باہر چلا گیا اور وہیں شادی کر لی۔ میری بیوی غیر ملکی تھی۔ وہ ٹریفک کے حادثے میں ہلاک ہو گئی۔ اُس کی نشانی دو بچیاں تھیں جنہیں میں اپنے ساتھ پاکستان میں لے آیا اور یہیں اُن کی پرورش شروع کر دی۔ اللہ نے کرم کیا اور معصوم بچیوں کے طفیل میرا کاروبار بھی جم گیا۔

اُس روز میں نے شہناز کو دیکھا تو مجھے وہ انوکھی شادی یاد آ گئی۔ آج اختر میرے گھر میں بیٹھا تھا۔

"سلیمان!" — اختر نے مجھے کہا — "اگر تو میری مدد نہ کرتا تو شاید ہماری شادی نہ ہو سکتی۔"

"سلیمان بھائی!" — شہناز نے حیرت زدہ ہو کر کہا — "مجھے تو پتہ ہی نہیں کہ آپ نے ہماری کیا مدد کی ہے۔"

"بھابی!" — میں نے کہا — "آپ کو کس نے پیغام دیا تھا کہ اختر نے سارا انتظام کر لیا ہے اور وہ آپ کا انتظار کر رہا ہے؟"

"ایک عورت نے" — شہناز نے شرماتے ہوئے کہا — "وہ پہلے بھی ان کے پیغام لاتی تھی۔"

"اُس عورت کو یہ پیغام میں نے دیا تھا" — میں نے کہا — "مجھے پتہ تھا کہ وہ کام کی عورت ہے۔"

"اور .... اور" — شہناز نے کچھ سوچتے ہوئے کہا — "ریلوے سٹیشن پر ٹکٹ کس نے لیا تھا اور مجھے گاڑی میں کس نے بٹھایا تھا۔ میں تو غور سے دیکھ نہ سکی کیونکہ رات کا وقت تھا۔ کہیں وہ آپ ہی تو نہیں تھے؟"

اُس کا شک درست تھا۔ میں نے پیغام یہی دیا تھا کہ کوئی بہانہ کر کے گھر سے نکلے اور ریلوے سٹیشن پہنچ جائے۔ میں نے ٹکٹ لیا اور اللہ کا نام لے کر اُسے رات کی گاڑی میں بٹھا دیا۔ گاڑی نے صبح کے وقت اُسے اختر کے پاس پہنچا دیا۔

شہناز کے منگیتر کا یہ شک درست تھا کہ وہ اختر سے ملتی ہے۔ شہناز نے ہی اختر سے کہا تھا کہ وہ اُس کے منگیتر کا دماغ درست کرے۔ میں اختر کا گہرا دوست ہوں لیکن آج تک نہیں سمجھ سکا کہ اتنی گہری دشمنی اتنی شدید محبت میں کس طرح بدل گئی تھی کہ زمانے کو پتہ بھی نہ چلا۔ یہ بات تو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ معصوم بچوں کی لڑائی کا انجام ایسا ہوگا۔

قاتل — جس نے اپنی سراغرسانی خود کی

پیرس کے ایک باغ میں ایک بچے کی لاش ملی۔ اُس کی عمر گیارہ سال تھی۔ لاش کی حالت یہ تھی کہ اس کا سر اور چہرہ کیچڑ سے بھرا ہُوا تھا۔ پوسٹ مارٹم سے معلوم ہُوا کہ بچے کا گلا ہاتھوں سے دبا کر مارا گیا ہے۔ بچے کے قتل کی خبر اخباروں میں شائع ہوئی۔ اس خبر کا عجیب پہلو یہ تھا کہ یہ خبر پولیس کی طرف سے اخباروں کو نہیں دی گئی تھی بلکہ کسی گمنام آدمی نے دی تھی۔ ہر اخبار کی خبر کے الفاظ ایک جیسے تھے۔ بچے کے والدین نے لاش پہچان لی اور انکشاف ہُوا کہ بچہ تین روز سے لاپتہ تھا۔ والدین سے پولیس نے پوچھا کہ انھوں نے بچے کی گمشدگی کی رپورٹ پولیس کو کیوں نہ دی؟ باپ نے جواب دیا کہ وہ اسے تلاش کرتا رہا تھا۔ ماں نے کہا کہ اسے بچے کے باپ نے کہا تھا کہ وہ خود اُسے تلاش کرے گا۔

یہ واقعہ مئی ۱۹۶۴ء کے پہلے ہفتے کا ہے۔ کیس پیرس کے محکمہ سراغرسانی کے ایک افسر سیمن کے حوالے کر دیا گیا۔ یہ واردات عجیب و غریب جرائم کے زمرے میں آتی ہے لیکن جرم اتنا عجیب و غریب نہیں جتنا مجرم ہے، اور خود سراغرساں سیمن بھی عجیب و غریب انسان ہے۔ اس کا شمار فرانس کے اُن معدودے چند سراغرسانوں میں ہوتا ہے جو اس فن کے صرف ماہر نہیں بلکہ سراغرسانی کو انھوں نے جنون بنا رکھا ہے۔ سیمن جنونی سراغرساں بھی ہے اور نفسیات کا ماہر بھی۔ وہ مجرموں کی نفسیات کو خوب سمجھتا ہے۔ اُس لیے جب اس بچے کے قتل کا کیس ہاتھ میں لیا تو اُسے کوئی غیر معمولی پریشانی نہ ہوئی۔ اس کا تجربہ

کچھ اس قسم کا تھا کہ بچوں کے قاتل آسانی سے پکڑے جاتے ہیں کیونکہ یہ پیشہ ور مجرم ہوتے ہیں۔ ان کا کوئی نہ کوئی ساتھی ان کی نشاندہی کر دیتا ہے مگر سیمن کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اُسے ایک نیا تجربہ ہونے والا ہے اور یہ بے مثال ہو گا۔

سیمن نے سب سے پہلے بچے کے والدین پر شک کا اظہار کیا۔ اُس کے لئے یہ امر عجیب تھا کہ بچہ تین روز غائب رہا اور انہوں نے گمشدگی کی رپورٹ پولیس کو نہ دی۔ اُس نے ان دونوں کے متعلق چھان بین کی تو پتہ چلا کہ میاں بیوی میں ناچاقی ہے۔ وہ رہتے تو ایک ہی گھر میں تھے لیکن علیحدگی کی صورت میں رہتے تھے۔ دونوں کے کمرے الگ تھے۔ بیوی (مقتول بچے کی ماں) زیادہ ہی خوبصورت تھی۔ خاوند شرابی اور بدکار تھا۔ کسی شراب خانے کا منیجر تھا۔ اُسے بیوی کے چال چلن پر شبہ تھا اور بیوی کو خاوند کے خلاف شکایت تھی کہ آوارہ اور بدمعاش ہے۔ اُن کے پڑوسیوں نے بتایا کہ اُن کی ناچاقی شدید ہے اور باپ اس بچے کو جو قتل ہو گیا ہے بہت پیٹا کرتا تھا۔ وہ یہ بھی کہا کرتا تھا کہ یہ بچہ اُس کا نہیں۔ اُس نے بچے کی پیدائش سے ہی بیوی پر بدچلنی کا الزام عائد کر دیا تھا۔

سیمن نے دونوں کو شامل تفتیش کر لیا۔ بچے کے باپ سے سوال جواب کرنے لگا تو اس کا یہ شک پختہ ہوتا گیا کہ بچے کو باپ نے قتل کیا ہے۔ بچے کی ماں نے بتایا کہ اس کا خاوند اپنے بچے سے سخت نفرت کرتا تھا۔ گزشتہ گیارہ برسوں میں میاں بیوی کے تعلقات اتنے کشیدہ ہو گئے تھے کہ اور کوئی بچہ پیدا نہ ہوا۔ اس سوال کے جواب میں کہ بیوی نے ایسے خاوند سے طلاق کیوں نہ لے لی، کہا کہ اگر وہ طلاق لیتی تو یہ ثابت ہوتا تھا کہ وہ بدچلن ہے۔ خاوند اُسے سزا کے طور پر طلاق نہیں دیتا تھا۔ بہر حال یہ امکان موجود تھا کہ بچے کا قاتل اپنا باپ ہے۔ سیمن نے دونوں کو پابند کر رکھا تھا اور ادھر اُدھر سے شہادتیں اور مزید معلومات حاصل کرنے کی کوشش میں تھا، مگر ایک خط نے سیمن کی سوچ کا رُخ بدل دیا۔

یہ خط "قاتل" کا تھا۔ نیچے "قاتل" لکھا ہوا تھا۔ خط سیمن کے نام تھا جس میں لکھا تھا ——"بچہ بازار میں بے کار گھوم پھر رہا تھا۔ میں نے اس کے ساتھ پیار سے باتیں کیں۔ اُس نے مجھے بتایا کہ وہ باپ کے ڈر سے گھر نہیں جانا چاہتا۔ میں نے بچے کو اپنی کار میں بٹھا لیا اور اس کے باپ کو ٹیلی فون پر رقم بتا کر کہا کہ جہاں سے بچے کی لاش ملی ہے وہاں یہ رقم پہنچا دو اور بچے کو زندہ لے جاؤ۔ باپ وعدے کے باوجود رقم لے کر نہ آیا تو میں نے تیسرے روز اُسی جگہ بچے کو لے جا کر قتل کر دیا۔"

سیمن نے بچے کے باپ سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ اُسے ایسا کوئی پیغام نہیں ملا۔ سیمن نے اس پر یقین نہ کیا۔ اگر باپ بچے کو حاصل کرنا چاہتا تھا تو قتل کا یہ بھی ایک طریقہ تھا کہ بچے کے عوض اُس سے رقم مانگی گئی جو اُس نے نہ دی اور بچہ قتل ہو گیا۔ سیمن نے خط لیبارٹری میں بھیج دیا تاکہ تحریر اور انگلیوں کے نشانات شناخت کر کے تفتیش آگے چلائی جاتی۔ لیبارٹری نے انگلیوں کے نشان واضح کر لئے۔ انہیں سزا یافتہ پیشہ ور مجرموں کی انگلیوں کے اُن نشانات سے ملایا گیا جو پولیس ہیڈ کوارٹر میں محفوظ تھے۔ یہ نشان کسی بھی نشان سے نہ ملے۔ ماہرین نے رپورٹ دی کہ یہ نشان ریکارڈ میں نہیں ہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس مجرم کو ابھی سزا نہیں ہوئی بلکہ وہ کبھی مشتبہ کی صورت میں بھی پولیس کے سامنے نہیں آیا۔ یہ نشان بچے کے باپ کے بھی نہیں تھے۔ شک یہ بھی کیا گیا تھا کہ کہیں باپ نے ہی یہ خط پولیس کو گمراہ کرنے کے لئے نہ لکھا ہو۔

یہ خط دوسرے دن کے اخباروں میں بھی شائع ہوا جو پولیس نے اخباروں کو نہیں دیا تھا بلکہ "قاتل" کی طرف سے ہر ایک اخبار کو ملا تھا۔ سیمن کا تجربہ کار دماغ سمجھ گیا کہ قاتل تشہیر پسند ہے اور وہ پیشہ ور نہیں۔ اُس نے والدین کو تفتیش سے فارغ کر دیا۔ تین روز بعد سیمن کو قاتل کا ایک اور خط ملا جس میں لکھا تھا کہ بچے کی ایک ٹانگ پر چھوٹا سا زخم تھا جس پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ سیمن نے بچے کے باپ کو خفیہ پولیس کی نگرانی میں رکھا۔ یہ شک ابھی باقی تھا کہ یہ خط وہی لکھ رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی پیرس کے تمام ڈاک خانوں

کی بھی نگرانی شروع ہوگئی۔ خفیہ پولیس کے آدمی ہر ڈاک خانے سے تقسیم ہونے والی ڈاک دیکھتے تھے تاکہ معلوم ہو جاتے کہ خط کون سے ڈاک خانے کے علاقے سے لکھے جا رہے ہیں۔ دو روز بعد ایک اور خط آیا۔ اس سے اگلے روز ایک اور خط اور اگلے روز ایک اور آ گیا۔ ان خطوط کی نقلیں "قاتل" نے اخباروں، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کو بھی بھیجیں۔ تمام خطوط تحریر سے ایک ہی ہاتھ کے لکھے ہوتے تھے اور انگلیوں کے نشان بھی ایک ہی جیسے تھے۔ جو خط ٹی وی کو لکھا گیا تھا وہ خبر سنانے والی ایک لڑکی کے نام تھا۔ قاتل نے اسے لکھا تھا کہ اُس نے ابھی تک اس بچے کے قتل کی خبر کیوں نہیں سنائی اور ان خطوط کا ذکر کیوں نہیں کیا جو وہ لکھ رہا ہے۔

ایک اور خط میں قاتل نے سیمن کو صرف اتنا لکھا ــــ "تم لوگوں نے بچے کی قمیض تلاش نہیں کی۔ گلی نمبر ۲۰۶ جہاں ختم ہوتی ہے وہاں سے کچھ آگے کھڈ ہے۔ قمیض وہاں پڑی ہے۔"

بچے کی لاش پر اُس کی قمیض نہیں تھی۔ اُس کی ماں نے بتایا تھا کہ بچہ قمیض پہن کر باہر گیا تھا۔ اب قاتل کے خط کے مطابق سیمن نے کھڈ میں جا کر دیکھا تو بچے کی قمیض وہاں جھاڑیوں میں پڑی تھی۔ وہ سمجھ نہ سکا کہ قمیض یہاں کیوں پڑی ہے۔ یہ خطوط اخباروں میں بھی شائع ہوتے تھے۔ پیرس کے لوگ جو اس کیس میں دلچسپی لے رہے تھے اب خوف و ہراس میں مبتلا ہو گئے کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ کوئی مجرم ایک بچے کو قتل کر کے پولیس کو بے وقوف بنا رہا ہے اور پولیس کی تفتیش ابھی ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھی۔ اگر کچھ معلومات حاصل ہوتی تھیں تو وہ مجرم نے خود ہی خطوں کے ذریعے دی تھیں، مگر لوگ یہ نہیں سمجھ سکتے تھے کہ سیمن قاتل کی تشہیر پسندی سے فائدہ اُٹھا رہا تھا۔ قاتل خود ہی وہ معلومات دے رہا تھا جو سیمن اور اس کے کارندوں کو مہینوں کی سراغرسانی کے بعد بھی نہ مل سکتیں اور وہ بھی شاید صحیح نہ ہوتیں۔ اسی لئے وہ اخباروں کے ایڈیٹروں کی حوصلہ افزائی کرتا تھا کہ وہ قاتل کی طرف سے آئے ہوئے خطوط نمایاں کر کے شائع کرتے رہیں۔

اکثر مجرم پولیس کو ایک دو خطوط لکھا کرتے ہیں مگر وہ پولیس کو گمراہ کرنے کی خاطر لکھے جاتے ہیں۔ اس کیس میں مجرم جو معلومات دے رہا تھا وہ وہ صحیح تھیں۔ سیمن کی اب کوشش یہ تھی کہ وہ ایسے حالات پیدا کرے کہ مجرم کی حوصلہ افزائی ہو اور وہ خط لکھتا رہے۔ وہ اپنے فن کا ماہر ہونے کے علاوہ نفسیات کا بھی ماہر تھا اس لئے وہ جان گیا کہ یہ قاتل تشہیر کے علاوہ یہ بھی چاہتا ہے کہ وہ پیرس کے لئے دہشت بن جاتے اور لوگ اُسے پُراسرار اور درندہ سمجھنے لگیں۔ اگر یہاں قاتل کے تمام خطوط پیش کئے جائیں تو ایک کتاب مرتب ہو جاتے۔ وہ اب دن میں دو دو خط پوسٹ کرنے لگا تھا اور ان خطوط میں اُس نے اپنی عادات اور اپنے کردار کے متعلق بھی اشارے دینے شروع کر دیئے تھے۔ ان سے پتہ چلا کہ وہ آوارہ خیال اور فحاشی پسند ہے۔ ننگی تصویریں دیکھنے کا عادی ہے۔ اُس کی تحریروں سے یہ اظہار بھی ہوتا تھا کہ اُس کے خط اخباروں میں شائع ہوتے ہیں تو اُسے لذت محسوس ہوتی ہے۔

سیمن نے ایک چال یہ چلی کہ ایک پریس کانفرنس بلوائی جس میں تمام اخباروں کے نامہ نگاروں کو بلایا گیا۔ سیمن نے نامہ نگاروں سے خطاب کرتے ہوتے کہا کہ پولیس کو ایک ایسے قاتل سے پالا پڑا ہے جسے گرفتار کرنا ناممکن ہو گیا ہے۔ یہ قاتل غیر معمولی طور پر دلیر اور سفاک ہے۔ ہم حیران ہیں کہ اُس نے ابھی تک کسی اور بچے کو قتل نہیں کیا — سیمن نے نامہ نگاروں کو اسی قسم کا طویل بیان دیا جو اگلے روز ہر ایک اخبار میں شائع ہو گیا۔ اس بیان نے لوگوں پر دہشت طاری کر دی۔ سیمن نے نامہ نگاروں کو یہ نہیں بتایا تھا کہ یہ بیان شائع کرانے سے اُس کا مقصد کیا ہے۔ بعض اخباروں نے سیمن کے خلاف ایڈیٹوریل لکھے۔ انہوں نے لکھا کہ سیمن جیسا کامیاب اور تجربہ کار سراغرساں یہ کہہ دے کہ قاتل کو گرفتار کرنا ناممکن ہو گیا ہے تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سیمن کبھی بھی ایک اچھا سراغرساں نہیں رہا یا اب وہ اس کیس میں قاتل کی مدد کر رہا ہے اور پیرس کے لوگوں پر دہشت طاری کرنا چاہتا ہے۔ ایک اخبار نے یہ بھی لکھا کہ اس قاتل کو گرفتار کرنا مشکل نہیں۔ سیمن جانتا ہے کہ قاتل کون

ہے اور وہ کہاں ہے۔ سیمن اس کیس کو پیچیدہ، پُراسرار اور دہشت انگیز بنا کر پبلک کے سامنے ہیرو بننا چاہتا ہے۔ پبلک کو خوف وہراس میں مبتلا کر کے ایک روز سیمن خاموشی سے قاتل کو پکڑے گا اور پھر ظاہر کرے گا کہ اُس نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر ایک بڑے ہی خطرناک قاتل کو پکڑا ہے۔

سیمن کے بالاتی حکام نے اس سے جواب طلبی کی اور اُسے تنبیہہ کی کہ وہ دیانت داری سے تفتیش کرے ورنہ تفتیش کسی اور کو دے دی جائے گی جو اُس کی بے عزتی کا باعث بنے گی۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ سیمن نے اپنے ہیڈکوارٹر کو کیا جواب دیا تھا، البتہ اُس نے یہ خبر بھی اخباروں میں شائع کرا دی کہ محکمے نے اُس سے جواب طلبی کی ہے۔ اُس نے تفتیش ختم ہونے کے بعد یہ انکشاف کیا تھا کہ اخباروں نے اس کے خلاف جو ایڈیٹوریل لکھے تھے وہ بڑے کام کے تھے۔ دراصل قاتل چاہتا ہی یہی تھا کہ اس کی واردات کو خوب تشہیر ملے اور وہ ایک پُراسرار قاتل بن جائے۔

قاتل نے سیمن کو ایک اور خط لکھا۔ اُس نے لکھا — "مجھے کثیر رقم درکار ہے۔ اس بچے سے مجھے کچھ نہ مل سکا۔ اب میں ایک اور بچے کو اغوا کروں گا اور اس کے عوض رقم طلب کروں گا۔ اگر رقم نہ ملی تو ایک اور قتل کی سراغرسانی کرنی پڑے گی۔ میں کسی امیر آدمی کا بچہ ڈھونڈ رہا ہوں۔ اگر مجھے یہ بچہ بھی قتل کرنا پڑا تو میں کوئی خط نہیں لکھوں گا۔ اس کے بعد پیرس میں ہر روز ایک بچہ قتل ہُوا کرے گا۔"

حسبِ معمول قاتل نے اس خط کی نقلیں تمام اخبارات کو بھیجیں جو شائع کر دی گئیں۔ اس سے دہشت اور خوف وہراس میں اضافہ ہو گیا۔ لوگوں نے اپنے بچوں کو گھر سے ذرا سا بھی دُور جانے سے منع کر دیا۔ بچے سکول جاتے تو مائیں یا باپ اُن کے ساتھ جاتے اور ساتھ لاتے۔ شہر میں خصوصاً سکولوں کے اردگرد، پولیس کے پہرے میں اضافہ کر دیا گیا۔ دو روز بعد سیمن کو قاتل کا ایک اور خط ملا جس میں اس نے دوسری باتوں کے علاوہ یہ بھی لکھا — "فرانس کی حکومت نے پیرس کے بچوں کی حفاظت کے لئے پوری پولیس فورس کی ڈیوٹی لگا دی ہے۔ میں جب بچہ تھا تو میری حفاظت کسی نے نہیں کی تھی۔ میرا بچپن

ٹلیفونوں میں گزرا ہے"—— اس خط میں اُس نے اُس کار کی قسم لکھی جس میں وہ مقتول بچے کو بٹھا کر لے گیا تھا۔ یہ کاریں فرانس میں بنتی تھیں۔ پولیس پر یہ ایک نئی مصیبت آپڑی۔ اس قسم کی تمام کاروں کے مالکوں کی چھان بین اور پوچھ گچھ شروع کردی گئی۔ یہ مہم شہریوں کے لئے بھی تکلیف دہ ثابت ہوتی۔

ایک اخبار نے قاتل کے متعلق شائع کیا جس میں یہ ثابت کیا گیا کہ قاتل ذہنی مریض معلوم ہوتا ہے۔ اور ہوسکتا ہے وہ بالکل پاگل ہو۔ دوسرے روز اسی اخبار کے ایڈیٹر کو قاتل کا خط ملا۔ لکھا تھا —— "میں الجزائر میں فرانسیسی فوج میں چھاتہ بردار تھا۔ میرا کمانڈر کرنل ماسو تھا۔ ایسے سفاک کرنل کی زیرِ کمان کسی سپاہی کا پاگل ہو جانا حیران کن نہیں"—— آپ کو یاد ہوگا کہ الجزائر پر فرانس کا قبضہ تھا۔ الجزائر کے مسلمانوں نے دس سال جنگِ آزادی لڑی اور آزادی حاصل کی تھی۔ فرانسیسیوں نے ان پر ظلم و تشدد کی حد کر دی تھی۔ ان میں ایک فرانسیسی کرنل ماسو بھی تھا جو درندہ صفت تھا۔ جو الجزائری مسلمان اُس کے ہاتھ چڑھ جاتا اسے وہ غیر انسانی اذیتیں دے دے کر جان سے مار ڈالتا .... قاتل نے اپنے خط میں اس کرنل کا نام لکھا تو پولیس نے اس کی یونٹ کا ریکارڈ دیکھا مگر یہ معلوم کرنا ممکن نہیں تھا کہ ان میں قاتل کون ہے۔

ایک روز سیمسن کے ساتھ قاتل نے ٹیلی فون پر بات کی۔ اُس نے کہا —— "میں قاتل بول رہا ہوں۔ یہ نہ بھولنا کہ میں ایک اور بچے کو قتل کرنے والا ہوں"—— اور فون بند ہو گیا۔ اخباروں کو ایک اور خط ملا جس میں صرف یہ فقرہ لکھا تھا —— "ایک سنسنی خیز حادثے کا انتظار کرو"—— اس سے ایک آدھ روز بعد پیرس کے ایک مضافاتی ریلوے سٹیشن پر ایک آدمی ٹہل رہا تھا جس کی طرف کسی نے توجہ نہ دی کیونکہ لباس سے مزدور سے لگتا تھا۔ ریل گاڑی آئی اور جب گاڑی چل پڑی تو اس آدمی کے ہاتھ میں ایک کتاب سی تھی وہ اس نے چلتی گاڑی میں گارڈ کے کمرے میں پھینک دی۔ گارڈ نے اگلے سٹیشن پر یہ کتاب پولیس کو دے دی۔ پتہ چلا کہ یہ کارٹونوں کی کتاب ہے جو مقتول بچے کے پاس تھی۔

اُس وقت تک سیمسن کے پاس قاتل کے تیس خطوط جمع ہو چکے تھے۔ ان

میں ایک خط میں یہ بھی لکھا تھا — "بچہ تین دن میرے پاس رہا اور منت سماجت کرتا رہا کہ میں اُسے ہمیشہ کے لئے اپنے پاس رکھ لوں۔ یہ بچہ پیار کا پیاسا تھا۔ اُس کے ماں باپ آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ بچہ اس گھر سے بھاگنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے اپنے پاس رکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر وہ میرے ہاتھوں قتل ہو گیا جس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے اس سے مسرت حاصل ہوتی تھی۔ میں بھی اسی قسم کا بدقسمت بچہ ہوا کرتا تھا۔ اگر اس بچے کے والدین آپس میں لڑنے کی بجائے بچے کی تربیت پر توجہ دیتے تو وہ بڑا ہو کر نام پیدا کرتا۔ میں نے بچے کو جس ٹھکانے پر پہنچا دیا ہے وہ اس کے لئے بہت اچھا ہے۔ میں بھی اسی ٹھکانے پر پہنچنا چاہتا ہوں"۔

سیمن خود بھی نفسیات کی سوجھ بوجھ رکھتا تھا۔ اُس نے یہ خطوط نفسیات کے ڈاکٹروں کے ایک بورڈ کے آگے رکھے۔ بورڈ نے رائے دی کہ قاتل ذہنی مریض ہے۔ اُس کے دل میں بچے یا اس کے والدین کے خلاف کوئی دشمنی نہیں۔ اس قاتل کا بچپن پیار اور شفقت کی محرومی میں گزرا ہے اس کی ذہنی حالت روز بروز بگڑ رہی ہے۔ وہ خود پسندی کا شکار ہے۔ اس کی انا بہت نازک ہے۔ غرض ماہرین نفسیات نے اُس کی تحریروں سے اُس کی شخصیت اور عادات و اطوار کی رپورٹ مرتب کر لی۔ سیمن نے اُس کی جو جسمانی ساخت پیش کی وہ اس طرح کی تھی کہ اُس کا قد درمیانہ ہے بلکہ اس سے بھی چھوٹا۔ یہ اندازہ اُس نے تحریروں اور تجربے کی بنا پر لگایا تھا۔

نفسیات کے ڈاکٹروں کی یہ رائے درست ثابت ہو رہی تھی کہ قاتل کا دماغ روز بروز خراب ہو رہا ہے۔ اُس نے خطوط کا سلسلہ جاری رکھا لیکن اب لفافے میں سے جو کاغذ نکلتا اس پر مرغی کے سر کی تصویر بنی ہوتی یا انسانی کھوپڑی کی۔ ایک تصویر جو پنسل سے بنائی گئی تھی یہ تھی ایک آدمی ایک درخت کے نیچے اوندھا پڑا تھا۔ نیچے لکھا تھا "قاتل" — سیمن کو ایک اور خط ملا جس میں قاتل نے لکھا تھا کہ کل وہ فلاں شراب خانے میں فلاں اخبار کے فلاں نامہ نگار کے ساتھ اس قتل کے متعلق باتیں کرتا رہا ہے۔ سیمن نے اس نامہ نگار سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ واقعی ایک آدمی جسے وہ نہیں جانتا تھا کہ کون ہے اُس کے پاس

بیٹھا اس واردات کے متعلق باتیں کرتا رہا تھا۔ نامہ نگار نے اُس کا حلیہ تقریباً وہی بتایا جو سیمن نے اُس کی تحریروں سے ذہن میں تیار کیا تھا۔ اُس کا قد ٹھگنا بتایا گیا۔ پولیس نے اُسی رات اس حلیے کے ایک آدمی کو پکڑ لیا۔ اُسے تشدد کا نشانہ بنایا، پوچھ گچھ کی مگر وہ اس بچے کا قاتل نہیں تھا، البتہ اُس نے ایک اور جرم کا اقبال کر لیا۔

سیمن نے اب طریقہ بدل دیا۔ اُس نے یہ سوچا تھا کہ قاتل کو بہت تشہیر مل چکی ہے۔ اُس نے اپنے خطوں میں مزید معلومات دینے کا سلسلہ بند کر دیا ہے۔ سیمن نے تمام اخباروں کے ایڈیٹروں سے کہا کہ وہ اب قاتل کا کوئی خط شائع نہ کریں اور کیس کے متعلق کوئی خبر بھی نہ چھاپیں۔ اخباروں نے تعاون کیا اور اس کیس کے متعلق چند دن کچھ بھی نہ لکھا۔ یہ واردات اتنی مشہور اور اہم ہو گئی تھی کہ اخباروں میں ہر روز پولیس کی کارگزاری شائع ہوتی تھی۔ اب اخبار اس ضمن میں خاموش ہو گئے۔ قاتل نے اخباروں کو خطوط لکھے جو سیمن کو دے دیئے گئے، شائع نہ کئے گئے۔ قاتل نے سیمن کو خط لکھا جس میں اُس نے غصے کا اظہار کیا۔ اُس نے لکھا کہ تم شاید یہ سمجھنے لگے ہو کہ میں قاتل نہیں ہوں۔ لندن کا اخبار "ڈیلی ایکسپریس" دیکھنا۔ تمہیں میرے قتل کا ثبوت ملے گا.... سیمن نے ہر روز "ڈیلی ایکسپریس" دیکھنا شروع کر دیا۔ ایک روز اُس اخبار کے خطوں کے کالم میں اُسے "قاتل" کے نام کا ایک خط نظر آیا جس میں قتل کی تفصیل لکھ کر قاتل نے لکھا تھا — "میں نے فرانس کی پولیس کے لئے مصیبت کھڑی کر رکھی ہے اور میں ہی اس بچے کا اصلی قاتل ہوں"۔

پیرس کے اخباروں کو بھی اس قاتل کے خطوط ملے تھے۔ کسی بھی اخبار نے خط شائع نہ کیا۔ سیمن کو قاتل کا ایک اور خط ملا۔ لکھا تھا — "میں نے ایک اور بچے کو قتل کر دیا ہے جس کی لاش تمہیں کبھی نہیں مل سکے گی۔ اگر تمہیں یقین نہ آئے تو تم ایک کار میں اس بچے کے خون چھینٹے اور دھبے دیکھ سکتے ہو۔ میں نے یہ کار چرائی تھی۔ اب نپولین کی قبر کے قریب کھڑی ہے"۔

سیمن نے نپولین کی قبر والے علاقے میں ریلوے اور وہاں سے مسلح بغیر وردی

پولیس پھیلا دی۔ اُس نے وہاں بڑی ہی پرانی ایک کار کھڑی دیکھی۔ اسے خطرہ تھا کہ یہ کار ایک دھوکہ ہو گی اور اگر وہ اس کے قریب گیا تو مجرموں کا گروہ اس پر حملہ کر دے گا یا دور سے گولی چلا دے گا — پولیس کا انتظام کر کے وہ کار کے قریب گیا۔ پچھلی سیٹ پر واقعی خون جما ہوا تھا۔ کار بہت ہی پرانی اور بری حالت میں تھی۔ سیمن نے کار وہیں کھڑی رہنے دی۔ ارد گرد رہنے والے کچھ لوگوں سے پوچھا کہ کار کس کی ہے۔ بعض آدمیوں نے لیگر نام کے ایک آدمی کو اس کار میں چند بار دیکھا تھا۔ انہوں نے سیمن کو بتایا کہ وہ اس کی رہائش سے واقف ہیں۔ پولیس کے دو آدمیوں کو بھیج کر لیگر کو بلایا گیا۔ وہ آ گیا۔ سیمن نے دیکھا کہ وہ ٹھگنے سے قد کا معمولی سا آدمی ہے۔

"یہ کار آپ کی ہے؟" — سیمن نے پوچھا۔

"جی ہاں!" — لیگر نے جواب دیا — "میری ہے"۔

"کیا یہ چوری ہو گئی تھی؟" — سیمن نے پوچھا۔

"مجھے معلوم نہیں" — لیگر نے جواب دیا — "اس کار کو کون چرائے گا"۔

سیمن نے اُس سے یہ نہ پوچھا کہ کار یہاں کیوں کھڑی ہے اور اس میں خون کس کا ہے۔ اس نے لیگر کے چہرے کا جائزہ بڑی غور سے لیا۔ لیگر کے ہونٹوں پر تبسم اور تبسم میں طنز کا رنگ نمایاں تھا۔ سیمن کار کے عقب میں چلا گیا جیسے کار کا معائنہ کر رہا ہو مگر اُس کی نظریں لیگر پر تھیں۔ اُسے یہ بھی توقع تھی کہ لیگر ریوالور نکال کر اُس پر گولی چلا دے گا یا ریوالور کی نالی اُس طرف کر کے اُس سے اپنی کوئی شرط منوائے گا، مگر لیگر کا تبسم مسکراہٹ بن گیا تھا۔

"مسٹر لیگر!" — سیمن نے اچانک اُس کے سامنے آ کر کہا — "میں آپ کے گھر کی تلاشی لینا چاہتا ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو ایک قتل کے سلسلے میں تفتیش میں شامل کر رہا ہوں اور آپ کو یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ آپ گواہ کی بجائے مشتبہ بھی ہو سکتے ہیں"۔

"ضرور تلاشی لیں" — لیگر نے کہا — "آئیں، میرے ساتھ چلیں"۔

لیگر اسی آبادی میں ایک کمرے میں رہتا تھا۔ یہ ایک بہت پرانی عمارت

تھی جس کے کمروں میں مختلف لوگ رہتے تھے۔ لیگر سیمن کو اس عمارت میں لے گیا سیمن اُس کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا۔ لیگر اپنے کمرے میں داخل ہُوا۔ سیمن نے کمرے کا جائزہ لیا۔ دیواروں کے ساتھ بے شمار تصویریں اور ہاتھ سے بنے ہُوتے خاکے چسپاں تھے۔ پرانی سی ایک میز پر بھی اس قسم کی بہت سی تصویریں پڑی تھیں۔ ان میں اخباروں سے کاٹے ہُوتے اُن خبروں کے تراشے بھی پڑے ہوتے تھے جو بچے کے قتل کے ضمن میں شائع ہوتی رہی تھیں۔ لیگر الگ کھڑا مسکرا رہا تھا۔ سیمن نے اُس کی مسکراہٹ دیکھی، تصویریں دیکھیں اور اخباروں کے تراشے دیکھے تو اُس نے بے ساختہ کہا — "مسٹر لیگر! اس بچے کو شاید تم نے قتل کیا ہے"۔

"بالکل نہیں" — لیگر نے ہنس کر کہا۔ اُسے ذرّہ بھر پریشانی نہ ہُوتی۔

سیمن نے فوراً پینترا بدلا اور بولا — "نہیں، نہیں۔ تم قاتل نہیں ہو سکتے۔ تمہارا چہرہ بتا رہا ہے کہ تم اتنے دلیر نہیں ہو کہ کسی کو قتل کر سکو"۔

"تم بکواس کرتے ہو" — لیگر نے چلا کر کہا — "مجھ میں اتنی جرأت ہے کہ میں ایسے کئی بچوں کو قتل کر سکتا ہوں"۔

"آہستہ بولو یار!" — سیمن نے دوستانہ بے تکلفی سے کہا — "تم دلیر ہو سکتے ہو قاتل نہیں ہو سکتے۔ آہستہ بولو۔ شک میں ہی پکڑے جاؤ گے"۔

"میں کہتا ہوں میں دلیر بھی ہوں قاتل بھی ہوں" — لیگر نے غصّے میں کہا — "میں ثابت کروں گا کہ بچے کا قاتل میں ہی ہوں۔ کیا تم نے میری کار میں خون نہیں دیکھا؟"

"لاش کے بغیر میں کیسے یقین کر لوں کہ تم نے کار میں ایک اور بچے کو قتل کیا ہے؟" — سیمن نے پوچھا۔

"میں لاش نہیں دکھا سکتا" — لیگر نے کہا — "میں نے جسے قتل کیا تھا اُس کی لاش تمہیں مل گئی تھی"۔

"دوسرے بچے کو تم نے قتل نہیں کیا اس لئے اس کی لاش نہیں ملے گی" — سیمن نے کہا — "تم میں اتنی جرأت نہیں کہ ایک کے بعد دوسرے بچے کو قتل کر سکو۔ تم میں اتنی عقل بھی نہیں کہ لاش کو ایسا چھپاؤ کہ پولیس کو مل نہ سکے"۔

"کیا یہ عقل کی بات نہیں کہ میں نے ہسپتال سے خون کی ایک بوتل

چُراتی تھی اور یہ خون کار کی پچھلی سیٹ پر انڈیل دیا تھا؟" — لیگر نے کہا —
"تم مجھے بیوقوف سمجھتے ہو۔"

سیمن نے سکون کی آہ لی کہ کوئی دوسرا بچّہ قتل نہیں ہُوا۔ اُس نے لیگر کو ساتھ لیا اور اپنے ہیڈ کوارٹر میں لے گیا۔ لیگر نے اس انداز سے اقبالِ جرم کر لیا جیسے وہ پولیس کو یقین دلانا چاہتا ہو کہ قاتل اُس کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا اور وہ بہت دلیر اور عقلمند انسان ہے۔ سیمن نے اُس کی گزری ہوئی زندگی کے احوال و کوائف فراہم کئے۔ اُس کا بچپن ایسے گھر میں گزرا تھا جہاں اُس کے لئے پیار نہیں تھا اور کوئی سکون نہ تھا۔ باپ اُسے مارتا پیٹتا تھا اور وہ اس کی ماں کے ساتھ بھی بہت بُرا سلوک کرتا تھا۔ ماں بھی آوارہ ہو گئی تھی۔ باپ شراب میں بدمست ہوتا تو ماں اپنے کسی دوست کے ساتھ باہر چلی جاتی۔ لیگر بڑا ہُوا تو وہ گلیوں میں مارا مارا پھرنے لگا۔ اُس نے سکول میں تعلیم حاصل کی۔ اس سے آگے نہ پڑھ سکا۔ پھر گھر سے بھاگ گیا۔ نوجوانی میں وہ فوج میں بھرتی ہو گیا اور ٹریننگ کے بعد اُسے الجزائر بھیج دیا گیا۔ اُس وقت الجزائر میں مسلمان جنگِ آزادی لڑ رہے تھے۔ فرانسیسی فوج کے دستے "باغیوں" کی سرکوبی کے لئے کبھی ریگزاروں میں مارے مارے پھرتے کبھی بستیوں میں۔

لیگر نے وہاں بہت قتل و غارت اور بربریت دیکھی۔ اس کے ارد گرد ہر وقت گولیاں چلتیں اور گرینیڈوں کے دھماکے گرجتے رہتے تھے۔ موت کا خوف ہر لمحہ اعصاب پر سوار رہتا تھا۔ اُسے یہ بھی پسند نہیں تھا کہ فرانس کسی دوسری قوم کو غلام بنائے رکھنے کے لئے اُس قوم کا کشت و خون کرتا رہے۔ ان تمام تر احوال و کوائف نے مل جل کر اُس کے دماغ کے خلیے ہلا ڈالے۔ بچپن کی تشنگی اور محرومیاں غالب آگئیں۔ اُس نے نہتے مسلمانوں پر گولی چلانے سے انکار کر دیا۔ اُس کی یونٹ کا کمانڈر کرنل ماسو ایک ظالم تھا۔ اُس نے لیگر کو ظالمانہ سزا دی۔ پھر اُسے فوج سے ڈسچارج کر کے فرانس بھیج دیا گیا۔ اس وقت اُس کی نفسیاتی خامیاں اُس کے دماغ پر غالب آگئیں۔ اُس نے لوگوں کو بتانا شروع کر دیا کہ وہ چھاتہ بردار ہے اور اُس نے الجزائر میں ا[illegible]

ہیں کہ اپنے افسروں کو حیران کر دیا ہے۔ اُس نے ایک بھولی بھالی لڑکی کو بھی بے بنیاد کارنامے سناتے اور ایسی باتیں کیں کہ لڑکی اس کی گرویدہ ہو گئی۔ اُس کے ساتھ شادی کر لی۔

نومبر ۱۹۶۳ء میں امریکہ کا صدر کینیڈی قتل ہو گیا تو اُس کے قاتل اوسوالڈ کی تصویر اخباروں میں شائع ہوئی۔ اوسوالڈ کی شکل لیگر سے ملتی تھی۔ لیگر نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ میں اوسوالڈ ہوں اور میں نے کینیڈی کو قتل کیا ہے۔ اُس کی لاف زنی بڑھتی گئی۔ وہ اپنے آپ کو شاعر بھی سمجھتا تھا اور متعدد کتابوں کا مصنف بھی۔ ایک ہی سال کے اندر اندر اس کی بیوی اُس کے رویّے سے پاگل ہو گئی۔ اسے ذہنی امراض کے ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ لیگر نے اسی ہسپتال میں ملازمت کر لی اور اس وارڈ میں ڈیوٹی لگوالی جس میں اس کی بیوی تھی۔ اس لڑکی کی ذہنی حالت اتنی زیادہ بگڑ گئی تھی کہ لیگر کو پہچانتی ہی نہیں تھی۔ لیگر اُسے دیکھتا رہتا۔ کبھی رو پڑتا اور کبھی خاموشی سے اُسے دیکھتا اور مسکراتا رہتا تھا۔ اُس نے گرفتار ہو کر اپنے بیان میں کہا تھا — "میں نے جب اس بچے کو اغوا کیا تو بچے نے مجھے اپنے گھر کے حالات سنائے۔ میرے دل میں اس کے باپ کے خلاف نفرت پیدا ہو گئی۔ میں اُس باپ کو سزا دینا چاہتا تھا۔ بچے نے مجھے کہا کہ میں اُسے اپنے پاس رکھ لوں۔ وہ مجھ سے پیار مانگتا تھا۔ میرے پاس پیار کہاں! میں نے کبھی پیار نہیں دیکھا۔ میں نے اس خیال سے بچے کو قتل کر دیا کہ اگر یہ زندہ رہا تو اس کی زندگی میری طرح گزرے گی۔ میں نے اسے آلام اور اذیت سے نجات دلا دی۔"

لیگر پولیس کو خط لکھ کر ذہنی سکون حاصل کرتا تھا۔ اخباروں میں اپنی تشہیر دیکھ کر اُسے مسرت حاصل ہوتی تھی۔ وہ اہمیت چاہتا تھا۔

عدالت نے ماہرینِ نفسیات کی رپورٹ لی۔ بورڈ نے اُسے پاگل قرار دے دیا اور عدالت نے اُسے پاگل خانے بھیج دیا۔

جنگ اور انسان

۱۹۴۳ء کا سال گزر رہا تھا۔ دوسری عالمگیر جنگ عروج پر تھی۔ دُنیا دم بخود تھی۔ فرانس پر جرمنی کا قبضہ تھا۔ فرانس کی سرحدوں کے اندر پہاڑیوں میں ساٹھ راہبوں نے اپنا الگ تھلگ گاؤں بسا رکھا تھا۔ اُن کے سوا وہاں اور کوئی نہیں رہتا تھا۔ وہ سب تارک الدنیا تھے۔ اُن کی اُس محدود سی دُنیا کے گرد و پیش میں اور اس کی فضاؤں میں جنگ کی ہولناکیاں غراتی توپوں اور طیاروں کی صورت میں دھاڑتی، گرجتی اور غراتی رہتی تھیں لیکن یہ ساٹھ انسان جنگ اور جنگ کی تباہ کاریوں سے لاتعلق عبادت میں مگن رہتے تھے۔ وہ روحانی امن سے سرشار تھے اور ان کے ذہنوں میں گناہ کے تصور کو دخل نہ تھا۔ وہ کسی ایک ملک کے باشندے نہیں تھے۔ ان میں انگریز بھی تھے، جرمن بھی، فرانسیسی اور اطالوی بھی، یونانی اور روسی بھی اور ان میں ولندیزی اور جاپانی بھی تھے۔ ان کے دل جغرافیائی اور سیاسی حدود کو پھلانگ کر ایک ہو گئے تھے۔ وہ کسی ملک کے باشندے نہیں بلکہ وہ انسان تھے، خدا کی عبادت میں ڈوبے ہوئے راہب۔

ایک رات جلتا ہوا ایک لڑاکا طیارہ ان کے گاؤں کے قریب آگرا اور یوں جنگ ان کے پڑوس میں گر کر جلنے لگی۔ ایک راہب نے دیکھ لیا۔ وہ بھاگتا اپنے ساتھیوں کے پاس آیا اور کہنے لگا:

"ایک برطانوی طیارہ گر پڑا ہے۔ ہوا باز زندہ ہے۔ طیارہ گرا نہیں، اُس نے خود اُتارا ہے۔ میں جانتا ہوں، وہ زندہ ہے۔"

ان راہبوں میں نایتھنی نام کا ایک راہب تھا۔ وہ اُٹھ بھاگا اور طیارے

تک پہنچا۔ اینتھنی انگریز تھا۔ اُس نے دیکھا کہ طیارہ جل رہا تھا اور اس کا ہواباز سیٹ (کاک پٹ) میں پھنسا ہُوا تڑپ رہا تھا۔ اینتھنی نے آگ کی پروا نہ کرتے ہوتے ہواباز کی پیٹیاں کھول دیں اور اسے طیارے سے نکال لیا۔ ہواباز کے سر، چہرے اور بازوؤں سے خون بہہ رہا تھا اور وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ اتنے میں چند اور راہب آ گئے۔ ان کی مدد سے اینتھنی ہواباز کو اپنے کمرے میں اُٹھا لایا۔ ان کے پاس مرہم پٹی کا انتظام تھا۔ انہوں نے ہواباز کے زخم دھوتے اور مرہم پٹی کر دی۔ وہ برطانوی ہواباز تھا اور ابھی تک بے ہوش۔

اینتھنی نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ہمارے اِرد گرد جرمن فوجوں کا قبضہ ہے۔ عین ممکن ہے کہ وہ اس طیارے کو گرتا دیکھ کر ہواباز کی تلاش میں آنکلیں۔ اینتھنی کا خدشہ غلط نہیں تھا۔ جنگ میں جب بھی دشمن کے طیارے کو گرایا جاتا ہے تو اس کے ہواباز کو زندہ گرفتار کرنے کے جتن کئے جاتے ہیں، تاکہ اس سے معلومات وغیرہ حاصل کی جا سکیں اور یہ بھی کہ وہ بھاگ نہ جاتے۔

اینتھنی نے کہا ——"ہم اسے کہیں چھپا لیں گے"—— لیکن دوسرے راہبوں نے شدید مخالفت کی اور کہا ——"ہم راہب ہیں، اگر جرمن آ گئے اور ہم سے پوچھ بیٹھے کہ اس طیارے کا ہواباز کہاں ہے تو ہم جھوٹ نہ بول سکیں گے، ہم عمر بھر کی عبادت اور خدا پرستی کو جھوٹ سے ناپاک نہ کر سکیں گے۔"

"میں اُن سے بات کروں گا"—— اینتھنی نے کہا۔ سارے راہب حیرت زدہ سا ہو کے اُسے دیکھنے لگے۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک راہب جھوٹ بول سکے گا۔

سحر طلوع ہُوتی تو ہواباز ہوش میں آ گیا۔ اینتھنی نے اُسے ایک اندھیرے کمرے میں لٹا دیا اور سب عبادت میں مصروف ہو گئے۔ اینتھنی عبادت سے جلدی فارغ ہو کر ہواباز کے پاس چلا گیا۔ ذرا ہی دیر بعد دروازے پر دستک ہُوتی۔ اینتھنی نے دروازہ کھولا۔ باہر ایک جرمن افسر اور تین چار سپاہی کھڑے تھے۔ اتنے میں چند اور راہب آن پہنچے۔

"رات کو جو جہاز گرا تھا اس کے ہوا باز کے متعلق آپ لوگوں کو کچھ علم ہے؟"
—جرمن افسر نے تحکمانہ لہجے میں پوچھا— "ہم طیارہ دیکھ آتے ہیں ہوا باز وہاں نہیں ہے۔ اگر مر جاتا تو اس کی لاش کاک پٹ میں ہونی چاہیے تھی"۔

راہبوں پر سناٹا چھا گیا۔ وہ جھوٹ نہیں بولنا چاہتے تھے لیکن اب محسوس کر رہے تھے کہ ایک زخمی انسان کو بے رحم جرمنوں کے حوالے کر دینا بھی گناہ ہے۔ وہ دو گناہوں کے درمیان کھڑے دل ہی دل میں تڑپنے لگے۔

اینتھنی بول اٹھا۔ اس نے کہا— "اگر وہ طیارے میں نہیں ہے تو رستے میں کہیں پیراشوٹ سے کود گیا ہوگا"۔

"غلط"— جرمن افسر نے گرج کر کہا— "ہمیں اطلاع ملی ہے کہ اس طیارے کو ہمارے ایک ہوا باز نے دس میل دور مارا تھا۔ اسے آگ لگی اور وہ آہستہ آہستہ گرنے لگا۔ ہمارے ہوا باز نے یہاں تک اس کا تعاقب کیا۔ اس نے برطانوی ہوا باز کو پیراشوٹ سے نکلتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ یہیں کہیں ہو سکتا ہے"۔

اینتھنی کو صرف ایک خدشہ تھا۔ وہ یہ کہ راہبوں کے اس تارک الدنیا گروہ میں چند ایک جرمن بھی تھے۔ گو وہ بھی راہب ہی تھے پھر بھی کوئی بعید نہ تھا کہ وہ انگریز ہوا باز کو اپنا دشمن سمجھ کر راز فاش کر دیتے لیکن اینتھنی کے پیش نظر ہوا باز محض ایک انسان تھا جو نہ جرمن تھا نہ انگریز نہ فرانسیسی، وہ ان کی پناہ میں تھا اور یہ پناہ گاہ ان کی نگاہ میں خدا کا گھر تھا۔

"تم لوگ بولتے کیوں نہیں؟"— جرمن افسر نے عتاب آلود لہجے میں کہا— "اگر وہ یہاں ہے تو اسے فوراً ہمارے حوالے کر دو۔ ہم جانتے ہیں تم راہب ہو لیکن ہماری ڈیوٹی میں دخل دو گے تو تمہاری عبادت گاہ کو بموں سے تباہ کروا دیں گے"۔

"اگر وہ طیارے میں نہیں ہے تو یہاں بھی نہیں ہے"— اینتھنی نے جھوٹ بول دیا— "ہو سکتا ہے جنگل میں چھپ گیا ہو"— اینتھنی نے کہہ تو دیا لیکن یہ جھوٹ اسے زہریلے تیر کی طرح لگا۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ اس کی

ذات نے کبھی جھوٹ کو جنم نہیں دیا تھا۔ باقی راہبوں کی آنکھیں اور منہ یوں کھل گئے جیسے کوئی اَن ہونی بات ہو گئی ہو۔ ان کی معصوم اور پاک بستی میں پہلا جھوٹ بولا گیا تھا اور یہ جھوٹ ایسے راہب نے بولا تھا جسے دنیا سے منہ موڑ کر اس بستی میں آتے عمر گزر چلی تھی۔

جرمن افسر سب کے چہروں کے تاثرات کی نمایاں تبدیلی کو بھانپ گیا اور طنز آلود مسکراہٹ سے بولا — "وہ یہیں ہے۔ جلے ہوئے طیارے کے قریب ہم نے خون کے قطرے دیکھے ہیں جو اس راستے تک آتے اور چند گزوں تک ختم ہو گئے۔ تم اسے اٹھا لاتے تھے ..." اس نے تمام راہبوں کے چہروں کا جائزہ لیا۔ ان کے گھبراتے چہرے راز فاش کر رہے تھے۔

جرمن افسر نے کہا — "میں تمہیں خبردار کئے دیتا ہوں کہ دشمن کو پناہ دینے کی سزا موت ہے۔ یہ سنگین جرم ہے۔ فوراً بولو اسے کہاں چھپا رکھا ہے؟"

"ہم تارک الدنیا اور خدا پرست لوگ ہیں" — اینتھنی نے کہا — "ہمیں آپ کی دنیا اور آپ کے دشمنوں کے ساتھ کوئی سروکار نہیں۔ تم مرو یا جیو۔ تمہارے دشمن انگریز جلیں یا مریں ہمیں کوئی واسطہ نہیں۔ ہم روحانی امن کے پرستار ہیں۔ اگر آپ کسی مذہب کو مانتے ہیں تو اسی مذہب کے نام پر ہمیں سکون اور امن سے رہنے دیجئے۔ اگر وہ ہوا باز یہاں آیا تو ہم آپ کو اطلاع کر دیں گے۔"

اینتھنی کا لب و لہجہ ایسا تھا کہ جرمن افسر بھی متاثر ہوا اور وہ اپنے سپاہیوں کو ساتھ لے کر چلا گیا لیکن ان راہبوں کے پیشوا کی جذباتی کیفیت بگڑنے لگی۔ وہ رہ رہ کے کہتا تھا — "اس مقدس بستی میں جھوٹ جیسا ذلیل گناہ سرزد ہو گیا ہے۔ خدا ہمیں کیونکر بخشے گا" — ایک بار تو اس کے آنسو نکل آئے اور اس نے اینتھنی سے کہا — "اس ہوا باز کو جرمنوں کے حوالے کر دو ورنہ اس کی خاطر جانے اور کتنے جھوٹ بولے جائیں گے۔ یہ جگہ ہماری عبادت گاہ ہے" — لیکن اینتھنی نہ مانا۔ اس نے پیشوا سے کہا — "وہ شدید زخمی ہے اور جرمنوں کی قید میں مر جائے گا۔ یہ گناہ بھی ہمارے نام لکھا جائے گا۔"

دن گزر گیا۔ رات بھی گزر گئی اور ایک اور دن طلوع ہوا۔ راہبوں پر

بے رحم سا سکوت طاری رہا۔ پُرامن اور مقدس فضا میں گناہوں کی تلخی اور بے چینی چھائی رہی اور سب یوں ڈرے ڈرے سے تھے جیسے ان پر کوئی آفت نازل ہونے والی ہو ——— اور وہ آفت آن پہنچی۔ وہ ایک اور جرمن آفسر تھا جس کے چہرے مہرے سے پتہ چلتا تھا کہ اس کے دل میں رحم کی کوئی رُتی بھی نہیں اس نے آتے ہی قہر آلود آواز میں کہا ——— "اُسے ہمارے حوالے کر دو، ورنہ ہم کمروں کی تلاشی لیں گے"۔

اندر ایک راہب زخمی ہوا باز کی پٹیاں بدل رہا تھا۔ یہ راہب جرمنی کا رہنے والا تھا۔ اینتھنی کو شدید خطرہ محسوس ہوا کہ اب راز فاش ہو جائے گا۔ کیونکہ جو راہب زخمی کے پاس تھا وہ جرمن تھا اور وہ اپنے ملک کے افسر کو دھوکہ نہ دے گا لیکن اس کا خطرہ غلط ثابت ہُوا۔ اندر جرمن راہب سُن رہا تھا کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ اس نے جلدی جلدی سے زخمی ہوا باز کے جُوتے اُٹھا کر بستر میں چھپا دیئے۔ مرہم پٹی کا سامان الگ رکھ دیا اور خود زخمی ہوا باز کے پہلو میں لیٹ کر اسے تو کمبل میں چھپا دیا اور خود اسی کمبل میں اس طرح لیٹ گیا کہ مُنہ باہر رکھا اور کراہنے لگا۔

جرمن افسر بغیر توقف اندر چلا گیا اور کمروں کی تلاشی لیتا زخمی کے کمرے میں پہنچا۔ وہاں نیم تاریکی تھی۔ راہبوں کے جسم تھر تھر کانپنے لگے۔ اب ان کے لئے جنگ کی ہولناکی سے محفوظ رہنا ممکن نہ تھا۔ جرمن افسر نے جب کسی کو کراہتے سُنا تو اس کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ آگئی لیکن بستر کے قریب پہنچا تو جرمن راہب نے کراہتے ہوتے جرمنی زبان میں افسر سے کہا ——— "میں جرمنی کا راہب ہوں، پیٹ کے درد سے مر رہا ہوں۔ تم یہاں کیوں آتے ہو؟ سنا ہے کسی برطانوی ہوا باز کو تلاش کر رہے ہو؟ میں جرمن ہوں، میں بھلا برطانیہ کے کسی لڑاکا ہوا باز کو کیسے پناہ دے سکتا ہوں؟"

جرمن افسر کے لئے یہ جواب بہت کافی تھا۔ وہ جرمنی کے ایک راہب کے غلط جواب کو سچ مان کر چلا گیا لیکن جرمن فوجوں کے ہیڈ کوارٹر کو یقین تھا کہ ہوا باز زندہ ہے اور اسی بستی کے گرد و نواح میں ہے۔ اس کا نکل بھاگنا ممکن

نہ تھا کیونکہ ہر طرف جرمن فوجوں کے مورچے تھے مگر بستی کی وہ تلاشی لے چکے تھے۔ یہ اُن کا مسئلہ تھا لیکن سب سے بڑا مسئلہ راہبوں کے پیشوا کے لئے پیدا ہو گیا تھا۔ اس کی مقدس بستی میں تین روز میں دو جھوٹ بولے گئے تھے۔ یہی خدشہ اس نے پہلے ہی ظاہر کر دیا تھا کہ اس ہوا باز کو چھپاتے رکھیں گے تو جانے اور کتنے جھوٹ بولنے پڑیں گے۔ لیکن اس سے بھی بڑا مسئلہ اینتھنی اور جرمن راہب کو درپیش تھا۔ وہ اب برطانوی ہوا باز کو جرمنوں کے چنگل سے بچا کر فرانس کی سرحد سے نکالنا چاہتے تھے۔ وہاں سے کوئی ایک سو میل دُور اُیراس نام کا ایک قصبہ تھا۔ اُیراس انگریزوں کے قبضے میں تھا۔ ہوا باز کے بچنے کی یہی ایک صورت تھی کہ اسے اُیراس تک پہنچا دیا جاتے۔ لیکن کیسے؟ راستہ جرمنوں کے قبضے میں تھا۔

ایک شام اینتھنی بستی سے غائب ہو گیا۔ کبھی کوئی راہب بستی سے غیر حاضر نہیں ہُوا تھا۔ اینتھنی کہاں چلا گیا تھا؟ کسی کو معلوم نہ تھا۔ وہ نصب شب سے ذرا بعد آیا لیکن پیدل نہیں بلکہ موٹر سائیکل پر سوار تھا۔ سب نے پوچھا کہ موٹر سائیکل کہاں سے لاتے؟ اس نے ایک اور جھوٹ بولا اور کہا —"راستے میں پڑا مل گیا ہے۔ جنگ میں ٹرک اور ٹینک بھی جگہ جگہ پڑے مل جاتے ہیں، یہ تو موٹر سائیکل ہے"— لیکن اس نے کسی کو نہ بتایا کہ وہ یہ موٹر سائیکل جرمنوں کے کھلے گودام سے اُٹھا لایا ہے۔ جرمنوں نے بے شمار موٹر سائیکل، ٹرک اور دیگر سامان ایک جگہ جمع کر رکھا تھا۔ یہ علاقہ ان کے قبضے میں تھا جہاں چوری چکاری کا خطرہ ہی نہ تھا لیکن ایک آدمی چپکے سے اس انبار سے ایک موٹر سائیکل اُٹھا لایا اور انہیں پتہ ہی نہ چلا۔

اینتھنی نے وقت ضائع نہ کیا۔ رات تھوڑی رہ گئی تھی اور وہ راستہ اور راستے کی دشواریاں بھی دیکھ آیا تھا۔ اُس نے زخمی ہوا باز کو کمبل میں لپیٹ کر موٹر سائیکل کی پچھلی سیٹ پر بٹھایا۔ خود اگلی سیٹ پر بیٹھا اور ایک چادر لے کر ہوا باز کو اپنے ساتھ باندھ لیا۔ اُسے کان میں کہا —"اپنے آپ کو تیز رفتار اور شدید جھٹکوں کے لئے تیار رکھنا"— اور دوسرے لمحے راہبوں کی چُپ چاپ

بستی موٹر سائیکل کی بے ہنگم پھٹ پھٹا پھٹ سے لرز اُٹھی اور یہ آواز اندھیرے سکوت کو جھنجھوڑتی اندھیرے میں تحلیل ہو گئی۔

اینتھنی کو کسی نے نہ روکا۔ رات کی تاریکی تھی اور جنگ زدہ تاریکی میں فوج کے موٹر سائیکل اور گاڑیاں چلتی ہی رہتی تھیں۔ فرانس کی سرحد دور نہیں تھی لیکن وہاں پہنچے تو دیکھا کہ جرمنوں نے لکڑی کے پھاٹک سے راستہ روک رکھا ہے۔ اینتھنی نے آنکھیں سکیڑ کر دیکھا۔ وہ کوئی مضبوط پھاٹک نہیں لگتا تھا۔ صرف ایک ٹہن سا تھا جس نے راہ روکی ہوئی تھی، جب موٹر سائیکل ذرا قریب پہنچا تو جرمن سنتری نے اُسے رُکنے کے لئے للکارا اور سڑک کے وسط میں آ گیا۔ اُس نے رائفل سیدھی کر لی تھی۔ اینتھنی نے اپنے پیچھے بندھے ہوئے ہوا باز سے کہا — "اب ہوشیار رہنا" — اور اس نے موٹر سائیکل کی رفتار اور تیز کر دی جرمن سپاہی اور آگے ہوا تو اسے موٹر سائیکل کی شدید ٹکر نے دور پرے پھینک دیا۔ آگے عارضی اور کمزور سا پھاٹک تھا۔ مضبوط فوجی موٹر سائیکل کی ٹکر سے بیل کا ٹہن ٹوٹ گیا اور اینتھنی سر نیچے کئے موٹر سائیکل کو سنبھالے اُڑتا چلا گیا۔ پیچھے سے کسی دوسرے سپاہی نے تین چار فائر کئے لیکن موٹر سائیکل اندھیرے میں غائب ہو چکا تھا۔

تین دن اور تین راتیں گزر گئیں، چوتھا دن بھی گزر گیا اور جب رات کی تاریکی پھیلنے لگی تو اینتھنی پا پیادہ، تھکا ہارا، پاؤں سُوجے ہوئے، بھوکا اور پیاسا بستی میں داخل ہوا۔ اُس نے جرمن راہب کو سارا واقعہ سنا دیا۔ یہ واقعہ بلکہ اینتھنی کا کارنامہ تمام راہبوں نے سُن لیا۔ وہ ہوا باز کو ایراس کی چوکی پر انگریز فوجیوں کے حوالے کر کے پا پیادہ واپس چل پڑا تھا۔ اس نے موٹر سائیکل پھینک دیا تھا۔ وہ چار روز جنگلوں میں چلتا رہا تھا۔

زخمی ہوا باز کو اپنی منزل پر پہنچا دیا گیا تھا لیکن اینتھنی اپنے ساتھیوں کے لئے معمہ بن گیا تھا۔ وہ پچیس برس گزرے اس بستی میں آیا تھا۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ وہ کون تھا سوائے اس کے کہ وہ برطانوی ہے۔ ان کی نگاہ میں تارک الدنیا راہب تھا لیکن اب اس نے کچھ ایسے کام کر دکھائے

تھے جو کوئی راہب نہیں کر سکتا۔ مثلاً یہ کہ اس نے طیارے میں سے ہوا باز کو کس طرح نکال لیا تھا؟ اُسے کیا خبر تھی کہ ہوا باز بندھا ہوا ہوتا ہے اور اس کی پیٹیاں کس طرح کھولی جاتی ہیں؟ اس نے جھوٹ بولنے کی جرأت کیسے کی؟ وہ موٹر سائیکل چرا لایا اور اس نے موٹر سائیکل چلانا کہاں سے سیکھا؟ اس نے جرمن سپاہی کو روند کر پھاٹک سے ٹکر مارنے کی جرأت کیسے کی؟

انہوں نے باری باری اینتھنی سے پوچھا تو اس نے سب کو صرف اتنا سا جواب دیا — "خدا کو منظور تھا"۔ وہ اب بالکل چُپ چاپ رہنے لگا۔ کتنی کتنی دن کسی سے بات تک نہ کرتا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی ذہنی حالت بگڑنے لگی اور بعض اوقات وہ اپنے آپ سے باتیں کرنے کے انداز سے بڑبڑاتا ہوا سنائی دیتا۔ تھوڑے عرصے بعد اس کے چہرے سے یوں پتہ چلتا جیسے وہ کسی اندرونی روگ سے بے حال ہو رہا ہو۔ تمام راہب پوچھ پوچھ کے تھک گئے۔ لیکن اس نے کسی کو اپنا روگ نہ بتایا، آخر دو سال بعد وہ ایک رات اپنے کمرے میں مُردہ پایا گیا۔ وہ چُپ چاپ مر گیا تھا۔

اُس کے مرنے کے بعد جرمن راہب نے انکشاف کیا۔ وہی ایک راہب اس کا رازداں تھا۔ اس نے بتایا کہ اینتھنی کو یہ روگ اندر ہی اندر کھاتا رہا ہے کہ اس نے ایک زخمی کی جان بچانے کے لئے کتنے گناہ کر ڈالے ہیں۔ اس نے جھوٹ بولا پھر موٹر سائیکل چُرایا پھر ایک جرمن سپاہی کو موٹر سائیکل کی ٹکر سے ہلاک کیا۔ جھوٹ، چوری اور قتل جیسے گناہ اسے دیمک کی طرح کھاتے رہے اور وہ اس جرمن راہب کے سامنے اکثر رو دیتا کہ اس کی پچیس برسوں کی عبادت مٹی میں مل گئی ہے۔

جرمن راہب نے یہ انکشاف بھی کیا کہ اینتھنی پہلی جنگِ عظیم میں برطانیہ کا لڑاکا ہوا باز تھا۔ وہ مسلسل ایک برس فضائی معرکے لڑتا رہا۔ ایک بار اس کے طیارے کو جرمن ہوا بازوں نے مار گرایا اور وہ جرمنوں کے علاقے میں اسی طرح جلتا ہوا گرا تھا۔ وہ بے ہوش تھا لیکن قریب ایک گاؤں تھا وہاں کے لوگوں نے اُسے طیارے سے نکال کر اپنے گاؤں میں چھپا لیا تھا جب وہ صحت یاب ہوا تو

اسے اس بستی کے متعلق پتہ چلا۔ وہ جنگ کے کشت و خون سے دل برداشتہ ہو گیا تھا اور گاؤں والوں کی شفقت نے اُس کے دل میں بنی نوع انسان کی محبت پیدا کر دی تھی۔ چنانچہ وہ راہبوں کی اس بستی میں آگیا اور سب کو بتاتا رہا کہ وہ بچپن سے مذہب پرست ہے۔

اینتھنی کا راز داں بھی ایک جرمن راہب تھا۔ باتوں باتوں میں اُس نے اپنی حقیقت سے بھی پردہ اٹھا دیا اور سب کو بتایا کہ اینتھنی تو ہوا باز تھا اور میں پہلی جنگ عظیم میں جرمن نیوی میں بحری افسر تھا۔ ایک روز میرا جہاز برطانیہ کے جہازوں نے تباہ کر دیا تھا۔ میں بڑی مشکل سے تیر کے نکل آیا، اور یہاں تک آپہنچا۔

جائیداد کا وارث

بُڑھیا نے جو آپ بیتی مجھے سنائی تھی اُس نے مجھے حیران نہیں کیا تھا۔ یہ چار دیواری کی دُنیا کی آپ بیتی ہے جو دیواریں اور دروازے بھی آپ کو سنائیں گے۔ ہم لوگ تو اس سے زیادہ حیرت ناک اور شرمناک ڈرامے کھیلا کرتے ہیں۔

آج میں بھی اسی بُڑھیا جیسی بوڑھی ہو گئی ہوں لیکن اللہ کا شکر ہر وقت ادا کرتی ہوں کہ اُس بُڑھیا کی طرح دَر دَر پر روٹی کی خاطر جا کھڑی نہیں ہوتی۔ گھر میں بھی عزت ہے اور سارے محلّے میں بھی۔ چالیس برس تو پاکستان کی عمر ہو گئی ہے۔ اس سے ایک برس پہلے، شاید جنوری فروری ۱۹۴۶ء کا واقعہ ہے۔ میں گھر میں اکیلی تھی۔ ایک ضعیف عورت جس کی عمر اتنی ہی تھی جتنی آج میری ہے، میرے گھر میں آئی۔

وہ بھکارن لگتی تھی۔ اُس کی بغل میں چھوٹی سی گٹھڑی تھی۔ میں نے اُسے آٹھ آنے دیئے۔

"نہ بیٹی!" — اُس نے کہا — "پیسوں کو میں کیا کروں گی۔ روٹی کھلا دے۔ خود کھا چکے ہو تو جو کچھ بچا ہے دے دے۔ یہیں بیٹھ کر کھا لوں گی۔"

میں نے آٹھ آنے اُس سے واپس نہ لئے۔ اُسے پیڑھی پر بٹھایا اور اُس کے آگے کھانا رکھا جو بچا کھچا نہیں تھا۔ وہ اس طرح کھانا کھانے لگی جیسے دو تین دِنوں کی بھوکی ہو۔ میں آپ کو یہ بتا دوں کہ میں اتنی سخی کیوں ہو گئی تھی۔ میری شادی ہوتے چھ سات سال گزر گئے تھے اور اولاد نہیں ہوتی تھی۔ یہ بیان کرنے کی کیا ضرورت ہے کہ جس بیوی کو چھ سات برسوں میں خدا ایک

بھی بچہ نہ دے تو اُس کے سُسرال کیا کیا باتیں کرتے ہیں اور وہاں اُس کے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہے۔ اولاد نہ ہونے کی ساری سزا بیوی کو دی جاتی ہے اور خاوند پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔

میں اس معاملے میں خوش قسمت تھی کہ میرا خاوند، اللہ اُسے جنّت میں جگہ دے، میری حمایت کرتا رہتا تھا۔ عام طور پر یوں ہوتا ہے کہ خاوند اپنا ڈاکٹری معائنہ نہیں کراتے کیونکہ اس میں وہ اپنی بے عزتی سمجھتے ہیں لیکن میرے خاوند نے جب دیکھا کہ تین برس گزر گئے ہیں اور اولاد نہیں ہوتی تو سب سے پہلے اُس نے اپنا ڈاکٹری معائنہ کرایا تھا۔ رپورٹ ٹھیک نکلی۔ اس کے بعد دو ڈاکٹروں نے میرا معائنہ کیا اور دونوں نے کہا کہ میرے اندر کوئی نقص نہیں۔ میرے خاوند نے یہاں تک خرچ کیا کہ مجھے دِلّی لے گیا۔ کسی نے بتایا تھا کہ انگریز لیڈی ڈاکٹر آئی ہے جو بے اولاد عورتوں کے نقائص کی سپیشلسٹ ہے۔

وہ واقعی بڑی سپیشلسٹ تھی۔ اُس نے میرے خاوند کا معائنہ بھی کرایا اور میرا معائنہ خود کیا۔ اُس نے یہ رپورٹ دی کہ ہم دونوں ٹھیک ہیں۔ بعض اوقات ایسے ہوتا ہے کہ میاں بیوی کے خون کا ملاپ اس طرح نہیں ہو سکتا کہ بچہ پیدا ہو۔ میں صحیح الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی کہ اُس نے ڈاکٹری زبان میں کیا لکھا تھا۔

میرے خاوند نے گھر آ کر سب کو بتایا کہ لیڈی ڈاکٹر کی رپورٹ کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی میرے خلاف ایک آندھی چل پڑی۔ میری ساس اور نندوں نے میرے خاوند کو مجبور کرنا شروع کر دیا کہ وہ مجھے طلاق دے دے۔ اس کے ساتھ ہی ایک تجربہ کار دائی اور ایک ہندو ڈاکٹر نے کہا کہ دِلّی والی انگریز لیڈی ڈاکٹر کی رپورٹ غلط ہے، ایسا نہیں ہو سکتا۔ سارے طوفان کا نشانہ صرف میں قرار دی گئی۔

ہمارے معاشرے میں طلاق ایک خوفناک لفظ ہے۔ اگر طلاق سے کسی کی مشکلات حل ہوتی ہوں اور طلاق ہی واحد علاج ہو تو بھی ہم لوگ طلاق

سے ڈرتے ہیں۔ ڈر لوگوں کا ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں "لوگ کیا کہیں گے؟" ایک ڈراؤنا محاورہ ہے۔ ہم اپنے حالات اور گھریلو اُلجھنوں کو صرف اس لئے اور زیادہ بگاڑ دیتے ہیں کہ لوگ کیا کہیں گے۔ میرے لئے سیدھا راستہ یہ تھا کہ طلاق لے لیتی۔ مجھے اس لئے بھی طلاق لے لینی چاہیے تھی کہ میرا خاوند میرے ساتھ دلی محبت کرتا تھا۔ میں اُس کی محبت کو اتنے بڑے امتحان میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی کہ وہ ساری عمر بے اولاد رہتا۔ اس کے علاوہ جس بُرے طریقے سے اُس کی ماں، بہنیں اور ایک خالہ اور میرا سُسر بھی اُس کے پیچھے پڑے ہوتے تھے، یہ اس کے لئے روحانی اذیت کا باعث تھا۔ میں اُسے اِس اذیت سے بچانا چاہتی تھی لیکن میں جب طلاق کا نام لیتی تھی تو وہ نہیں مانتا تھا۔

میرا خیال ہے کہ شاید میں جھوٹ بول رہی ہوں۔ طلاق کے تصور سے ہی میرا کلیجہ منہ کو آجاتا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ مجھے طلاق ہو جاتی تو میرے والد صاحب کا ہارٹ فیل ہو جاتا۔ میری امی پہلے ہی بیمار رہتی تھیں۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ مجھے پیار اور محبت کرنے والا خاوند ملا تھا اور یہ جائیداد اور روپے پیسے والا خاندان تھا۔ لڑکیوں والے یہی سوچا کرتے ہیں کہ لڑکی خوشحال گھرانے میں جاتے تو سُکھی رہے گی۔ ماں باپ کی عزّت اس وجہ سے بھی تباہ ہو جاتی ہے کہ طلاق یافتہ عورت پر لوگ کئی طرح کے الزام تھوپ دیتے ہیں۔ بدچلنی تو ایک الزام ہے لیکن جب یہ مشہور ہو جاتا ہے کہ یہ عورت اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں تو کوئی بھی اُسے قبول نہیں کرتا۔ میری عمر ابھی پچیس سال کے لگ بھگ تھی۔ اگر میں طلاق لے لیتی تو میری ساری عمر تنہا گزر جاتی۔

میں بھی اُن پیروں، عاملوں اور شاہ صاحبوں کے پاس گئی جن کے متعلق مشہور تھا کہ بے اولادوں کو اولاد دیتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ مجھے ایسا پیر یا عامل نہیں ملا جس نے مجھے کہا ہو کہ دوسرے کمرے میں چلو یا رات کو آنا۔ میں اسی بات سے ڈرتی تھی لیکن یہ اُس قسم کے نوسرباز یا جعلی پیر نہیں تھے جن کی کہانیاں آپ سنایا کرتے ہیں مگر ان سب کے تعویذ اور ٹونے ٹوٹکے بے کار

ثابت ہوتے۔ میں نے کوئی خانقاہ نہیں چھوڑی، کوئی مزار نہیں چھوڑا۔ کسی نے کہا کہ فلاں خانقاہ پر جاؤ اور قبر کی تھوڑی سی خاک منہ میں ڈالو۔ اس طرح میں مختلف مزاروں اور خانقاہوں کی کم از کم ایک پاؤ مٹی کھا گئی ہوں گی۔

میرے خاوند نے مجھے روپے پیسے کی کمی کبھی نہیں ہونے دی تھی۔ میں دل کھول کر خیر خیرات کرتی تھی۔ اپنے میکے جا کر صدقے کے بکرے بھی دیتے۔ راتوں کو جاگ جاگ کر نفل پڑھے اور وظیفے بھی کئے لیکن جب اللہ کو ہی منظور نہ تھا تو ناکامی ہونی تھی۔ یہ میری عادت ہو گئی تھی کہ میرے دروازے پر کوئی بھکارن آتی تھی تو میں اُسے عزت سے بٹھا کر روٹی کھلایا کرتی تھی۔ اس بڑھیا کو بھی میں نے اپنی اسی عادت کے مطابق عزت سے بٹھا کر کھانا کھلایا۔ یہ تو بہت ہی بوڑھی تھی۔ سر کے بال دُودھ کی طرح سفید ہو چکے تھے اور چہرے پر گہری لکیروں کا جال تنا ہُوا تھا۔ کمر جھکا کر چلتی تھی۔

"تُو گھر میں اکیلی کیوں ہے بیٹی!" ــــ بڑھیا نے پوچھا ــــ "شادی ہوتی ہے یا نہیں؟"

"ہاں اماں!" ــــ میں نے کہا ــــ "میری شادی ہُوتے تو چھ سات سال ہو گئے ہیں۔ یہ میرے خاوند کا گھر ہے۔"

"ساس سُسر نہیں ہیں؟"

"ہیں اماں!" ــــ میں نے جواب دیا ــــ "ہم اُن سے الگ رہتے ہیں۔"

میں اور میرا خاوند بھی الگ نہیں ہونا چاہتے تھے۔ میں تو ساس اور سُسر کی دل و جان سے خدمت کرنا چاہتی تھی لیکن ان لوگوں نے میرا اور میرے خاوند کا جینا حرام کر دیا تھا۔ میں برداشت کرتی رہی لیکن میرے خاوند نے میرے سکون کی خاطر یہ مکان کرائے داروں سے خالی کرا لیا اور مجھے یہاں لے آیا تھا، لیکن میرے لئے اور زیادہ مشکل پیدا ہو گئی تھی۔ ساس اور نندوں نے یہ مشہور کر دیا تھا کہ میں اُن کے بیٹے کو اُن سے چھین کر لے گئی ہوں۔ خیر، ان باتوں کو چھوڑیں۔ یہ بڑی لمبی اور بڑی تلخ باتیں ہیں۔ ان

میں کوئی بات بھی نئی نہیں۔ چار دیواری کی دنیا کے لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ مجھے کیا کیا باتیں سننی پڑی ہوں گی۔

"بچے کہاں ہیں تیرے؟" — بڑھیا نے پوچھا — "کتنے بچے ہیں؟ ..... شادی کو چھ سات سال ہو گئے ہیں نا!"

"دعا کرو اماں!" — میں نے کہا — "خدا میری گود میں بھی ایک بچے کی خیرات ڈال دے۔"

بڑھیا پیڑھی پر بیٹھی بیٹھی جیسے اچھل پڑی ہو۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں نے اس سلسلے میں کیا کچھ کیا ہے۔ میں نے اسے یہ ساری باتیں سنا دیں جو میں آپ کو سنا چکی ہوں۔ اس بوڑھی بھکارن کو کوئی بھی اس قابل نہ سمجھتا کہ اسے گھر کی اور دل کی باتیں سناتا لیکن میرا سینہ ان باتوں سے جلتا رہتا تھا۔ اپنی صرف ایک سہیلی رہ گئی تھی جو میرے پاس آیا کرتی تھی۔ باقی سب نے میرا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ انہیں ڈرایا گیا تھا کہ میں کسی پیر کی بددعائی ہوئی ہوں اور میرا سایہ منحوس ہے۔ جس سہاگن پر میرا سایہ پڑے گا اس کی کوکھ سوکھ جائے گی۔ میں نے دل کا غبار ہلکا کرنے کے لئے اس بوڑھی عورت کو سب کچھ سنا دیا۔

"میں تیرے پاؤں کی خاک ہوں بیٹی" — اس نے کہا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کہنے لگی — "میں بھی بے اولاد تھی۔ تو کچھ پڑھی لکھی معلوم ہوتی ہے۔ میری بات سمجھ جائے گی۔ میں تجھے ایک خاص بات سمجھانا چاہتی ہوں.... جو تجھ پر بیت رہی ہے وہی مجھ پر بھی بیتی تھی بلکہ مجھے تجھ سے زیادہ لعنتیں سننی پڑی تھیں۔ میرے سسرال تمہارے سسرال سے کچھ زیادہ ہی امیر تھے۔ تیرے خاوند نے تو اپنا ڈاکٹری معائنہ کرا لیا ہے، میرے خاوند نے نہیں کرایا تھا۔ ڈاکٹری معائنہ تو میرا بھی نہیں ہوا تھا۔ اس وقت کہاں رواج تھا ڈاکٹری معائنوں کا۔ ساری لعنت اور پھٹکار عورت کے لئے تھی اور یہی سننا پڑتا تھا کہ کسی مرشد کی بددعائی ہوئی ہے۔ میرے خاوند نے مجھے کبھی عورتوں کی طرح طعنے تو نہیں دیتے تھے لیکن یہ ضرور کہتا تھا کہ بچہ پیدا کرو....

"میں بھی تیری طرح طلاق سے ڈرتی تھی۔ وجہ وہی تھی جو تُو نے بتائی ہے۔ ایک طرف اپنی زندگی کہ یہ خاوند کے بغیر کیسے کٹے گی۔ دوسری طرف ماں باپ کی عزت کا خیال تھا اور یہ بھی کہ وہ بے چارے میرے جس فرض سے فارغ ہو گئے تھے وہ پھر اُن کے سر پر آپڑتا .... عورت بڑی مجبور چیز ہے بیٹی! مشہور ہے کہ عورتیں بولتی بہت ہیں اور عورت کی زبان ہر وقت چلتی رہتی ہے لیکن عورت سچی بات نہیں کہہ سکتی کہ وہ سب کو بُری لگتی ہے اور وہ اپنے دل کی بات بھی نہیں کہہ سکتی۔ اُسے اتنا مجبور کر دیا جاتا ہے کہ وہ کہیں نہ کہیں پھسل جاتی ہے .... ایسے ہی میرے ساتھ ہُوا ....

"میرے خاوند کو جائیداد کا غم کھاتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ ایک لڑکا چاہیئے۔ اگر ہم بے اولاد مر گئے تو اپنی جائیداد کُتّے اور کوّے کھا جائیں گے۔ اُسے جائیداد کے وارث کی ضرورت تھی۔ شادی کے نُو سال گزر گئے تھے۔ میں نے اولاد کی امید دل سے نکال دی تھی۔ ایک روز خاوند نے مجھے کہا کہ وہ مجھے طلاق نہیں دے گا لیکن جائیداد کا وارث پیدا کرنے کے لئے دوسری شادی کرے گا اور میں اُسے اجازت دے دوں ....

"سوکن لانے کے لئے بیوی سے کون پوچھتا ہے بیٹی! پہلی بیوی کو ایک روز پتہ چلتا ہے کہ اُس کی سوکن آگئی ہے۔ اگر پہلی تین پانچ کرے گی تو اُسے اُٹھا کر باہر پھینک دیں گے۔ انگریز کا قانون بھی یہی کہتا ہے اور ہمارے اپنے مولوی بھی یہی کہتے ہیں۔ مولوی کسی کو کیا کہیں گے۔ وہ تو کہتے ہیں چار بیویاں رکھو۔ میرے خاوند کے دل میں میری کچھ چاہت تھی۔ اس لئے اُس نے پوچھا تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ مرضی کا مالک ہے، چاہے تو مجھے طلاق دے دے، چاہے تو تین بیویاں اور لے آئے، میں کہیں کونے میں پڑی جلتی رہوں گی ....

اُس نے فیصلہ سُنا دیا کہ وہ گھر کی مالکہ مجھے ہی بنائے رکھے گا اور دوسری بیوی نوکرانی ہوگی، لیکن بیٹی میں نُو سال پُرانی ہو چکی تھی۔ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ نوجوان لڑکی کے مقابلے میں خاوند مجھے گھر کی مالکہ بنائے رکھتا۔

اُس رات میں بستر پر یوں تڑپتی رہی جیسے میں انگاروں میں پڑی ہوتی ہوں۔ سیانے کہتے ہیں کہ رات کو کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہیئے لیکن میں نے رات کو ایسی حالت میں ایک فیصلہ کیا کہ میرا دماغ میرے قابو میں نہیں تھا....

"لیکن بیٹی! فیصلے تو اللہ میاں کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ مجھے اُس رات اُلٹی سیدھی سوچیں آتی رہیں۔ میں نے یہاں تک کفر سوچا کہ خدا ہے ہی نہیں۔ ایسی ہی اور بہت سی خرافات تھی جو میرے دماغ میں آتی رہی اور میں نے فیصلہ یہ کیا کہ خدا ہے ہی نہیں تو میں کیوں ماتھا رگڑتی ہوں.... اُس رات کے ایک سال بعد خدا نے مجھے چاند سا بیٹا دیا۔ تُو سوچ سکتی ہے کہ میرے سُسرال نے اور خاص طور پر میرے خاوند نے کس طرح خوشیاں مناتی ہوں گی۔ روپیہ پیسہ پھٹے ہوئے کاغذوں کے پُرزوں کی طرح اڑایا گیا۔ شادی پر اتنی خوشی نہیں منائی گئی تھی جتنی بچہ پیدا ہونے پر منائی گئی.... جائیداد کا وارث پیدا ہو گیا تھا....

"اس بچے کو ہم نے یُوں پالا جیسے گلاب کا پھول تھا اور یہ خطرہ لگا رہتا تھا کہ اس کی کوئی پتی مُرجھا نہ جائے۔ اتنی لمبی باتیں کیا سناؤں۔ یہ سمجھ لو کہ بچے کو ہم گرم سرد ہوا بھی نہیں لگنے دیتے تھے۔ اُس نے اگر پانچ پانچ دس دس روپوں کے نوٹ پھاڑنے شروع کر دیئے اور میں نے اُس کے ہاتھ سے نوٹ لینے کی کوشش کی تو میرے خاوند نے مجھے ڈانٹ دیا کہ پھاڑنے دو۔ بچہ جب سکول جانے لگا تو وہ دوسری طرح نوٹ پھاڑنے لگا۔ بڑی مہنگی فرمائشیں کرتا تھا جو باپ بڑے شوق سے پوری کر دیتا تھا۔ نویں جماعت میں پہنچ کر جائیداد کے وارث نے سکول جانے سے صاف انکار کر دیا۔ میں نے خاوند سے کہا کہ اس پر ذرا سختی کرنی پڑے گی، لیکن باپ پر جائیداد اور روپے پیسے کا نشہ سوار تھا....

"لمبی چوڑی باتیں کیا سناؤں بیٹی! میں طلاق سے اور سوکن سے تو بچ گئی لیکن خدا نے جو بیٹا دیا وہ بہت بڑی مصیبت بن گیا۔ میں نے کئی بار سوچا کہ اس سے تو بہتر تھا کہ تب طلاق لے لیتی۔ بچہ سکول سے ہٹا تو شہر کے

بدمعاش لڑکوں کی منڈلی میں جا بیٹھا۔ یہ لفظ اُس کی زبان پر چڑھے ہوتے تھے —پیسے دو'— میں تو کچھ سختی کرتی تھی لیکن میرا خاوند اُس کا مطالبہ فوراً پورا کر دیتا۔ وہ کہتا تھا کہ سب مال اور جائیداد اسی کی ہے۔ یقین کرنا بیٹی! میرے خاوند نے یہ حماقت بھی کی کہ اپنے باپ کو کہا کہ جائیداد اُس کے نام کر دے۔ میرا خاوند بھی اپنے ماں باپ کا اکلوتہ بیٹا تھا۔ باپ نے تمام جائیداد بیٹے کے نام کر دی اور بیٹے نے جائیداد اپنے بیٹے کے نام کر دی اور چار دیگیں پلاؤ کی مسجدوں اور خانقاہوں میں لے جا کر تقسیم کیں۔ یہ شکرانہ تھا کہ اُس کی یہ مراد پوری ہو گئی ہے کہ اُس نے جائیداد اپنے وارث کے حوالے کر دی ہے.....

"اس سے ایک سال بعد میری ساس فوت ہو گئی۔ سات آٹھ مہینے گزرے تو سُسر بھی چل بسا۔ وہ اپنی عمر کھا چکے تھے۔ اِدھر جائیداد کا وارث انیس برس کا ہو گیا تھا اور اُس نے رنڈیوں کے بازار میں جانا اور روپیہ اس بازار کی نالیوں میں بہانہ شروع کر دیا تھا۔ شراب تو اب بھی (۱۹۴۶ء) پانی کی طرح ہوٹلوں میں ملتی ہے۔ مختصر یہ کہ وہ پوری طرح عیاشی اور گناہوں میں ڈوب گیا تھا....

"ہم نے اُس کی شادی کا بندوبست کیا تو اُس نے صاف انکار کر دیا۔ اُسے اب صرف ایک لڑکی کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اب تین تین چار چار راتیں باہر رہنے لگا۔ گرمی میں وہ کبھی پندرہ دن کبھی بیس دن لاپتہ رہتا۔ بعد میں پتہ چلتا کہ وہ ڈلہوزی یا شملہ چلا گیا تھا۔ میں اور میرا خاوند وقت سے پہلے بوڑھے ہونے لگے۔ ایک روز میرا خاوند باہر سے آیا تو میں اُس کی چال اور اُس کا چہرہ دیکھ کر گھبرا گئی۔ میں نے آگے ہو کر اُسے تھاما اور چارپائی تک لائی۔ وہ چارپائی پر گر پڑا۔ اس کے ساتھ ہی وہ سِسک سِسک کر رونے لگا۔ کہنے لگا اس سے تو ہم بے اولاد اچھے تھے۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ اب کیا ہوا ہے۔ اُس نے بتایا کہ بیٹے نے بڑی حویلی بیچ ڈالی ہے۔ وہ جوا بھی کھیلتا تھا۔ اُس وقت ہماری عمریں پچاس سال سے اُوپر ہو گئی تھیں۔ جسم میں برداشت کی قوت نہیں رہی تھی۔ اِس عمر کو بڑھاپے کی عمر کہتے ہی نہیں تھے لیکن میری اور میرے خاوند کی کمر دوہری ہو گئی تھی....

"اب ہم رونے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ میں جس طرح اولاد کی خاطر پیروں وغیرہ کی دہلیزوں پر ماتھے رگڑتی تھی اور ہندوؤں کے پنڈتوں تک سے بھی ٹونے ٹوٹکے معلوم کرتے تھے، اب اُس سے زیادہ اُنہی جگہوں پر جانے لگی اور رو رو کر مرادیں مانگنے لگی کہ بیٹا سیدھے راستے پر آجاتے، لیکن بیٹا دُور ہی دُور ہوتا گیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہمارے پاس چھوٹا سا ایک مکان رہ گیا۔ جائیداد کے وارث نے تمام جائیداد ریس میں اُڑا دی یا ناچنے گانے والیوں کو کھلا دی۔ اُس کی عمر تیس سال تھی جب اُس کا باپ جو بیٹے کے غم میں بیمار پڑا رہتا تھا اللہ کو پیارا ہو گیا۔ بیٹے نے اتنا کرم کیا کہ باپ کی آخری رسومات پوری کر دیں اور مجھے کچھ پیسے دے دیئے اور اس کے بعد وہ غائب ہو گیا ....

"دو تین سال بعد واپس آیا اور مجھے یہ خبر سنائی کہ وہ یہ مکان بھی بیچ رہا ہے۔ اُس روز میں بَین کر کے روتی۔ اپنے سینے اور اپنے مُنہ پر دو ہتڑ مارے جیسے میرا بیٹا مر گیا ہو۔ سارا محلہ اکٹھا ہو گیا۔ دو بزرگوں نے میرے بیٹے کو شرم دلاتی لیکن وہ اخلاق سے اتنا گر گیا تھا کہ اُس نے ان بزرگوں سے کہا کہ وہ اُس کے معاملے میں دخل نہ دیں ورنہ بے عزتی کرالیں گے .... آخر یہ مکان بمع سامان ایک ہندو نے خرید لیا اور بیٹے نے مجھے ایک کوٹھڑی دے دی جو گلی میں ایک کمرہ ہے۔ وہ دن اور آج کا دن، بیٹا کبھی چھ سات مہینے اور کبھی سال بعد آتا ہے اور کچھ روپے میری جھولی میں پھینک کر چلا جاتا ہے۔ دو سال ہو گئے ہیں وہ نہیں آیا۔ معلوم نہیں زندہ ہے مر گیا ہے، میں نے اُسے دل سے اُتار دیا ہے ....

"کوئی ایک مہینہ گزرا ہو گا۔ میں اپنی کوٹھڑی میں لیٹی ہوتی تھی۔ باہر سے دو تین آدمی آہستہ آہستہ گزر رہے تھے۔ ایک نے کہا — اس بڑھیا کو دیکھ کر خدا یاد آجاتا ہے۔ بڑے امیر لوگوں کی بہو تھی۔ باہر کی ہواؤں نے بھی اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ محتاج ان کے دروازے پر کھڑے رہتے تھے لیکن آج یہ دوسروں کی محتاج اس کال کوٹھڑی میں پڑی ہے۔ معلوم نہیں

خدا نے اسے کس گناہ کی سزا دی ہے۔ یہ تو پردہ نشین عورت تھی!...

"بیٹی! یہ ہے وہ بات جو میں تجھے سنانا چاہتی تھی۔ لوگ سمجھتے تھے کہ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا اور میں پردہ نشین تھی۔ وہ حیران ہو کر کہتے تھے کہ ایسی پاکدامن عورت کو خدا نے یہ کیسی سزا دی ہے۔ بیٹے نے تباہ کر کے رکھ دیا.... بیٹی! اگر بیٹا حلال کا ہوتا تو حلال کی جائیداد یوں کتے اور کوّے نہ کھا جاتے۔"

"کیا کہہ رہی ہو اماں!" ــــ میں نے پوچھا ــــ "بیٹا حلال کا نہیں تھا؟"

"نہیں" ــــ اُس نے جواب دیا ــــ "جس مجبوری میں تم پڑی ہوتی ہو، کیا تم محسوس نہیں کر سکتیں کہ عورت مجبوری میں کیا کچھ سوچتی ہے۔ میری حالت تم سے بہت زیادہ خراب کر دی گئی تھی۔ میری دُور پار کی ایک خالہ تھی۔ اُس کا بیٹا جو مجھ سے دو تین سال چھوٹا تھا۔ ہمارے گھر آتا رہتا تھا۔ وہ اچھی شہرت کا آدمی نہیں تھا۔ وہ اپنی خوبصورتی پر بہت فخر کرتا تھا لیکن اُس کی شادی ایسی لڑکی کے ساتھ کر دی گئی جو بالکل ہی خوبصورت نہیں تھی۔ اس آدمی کے ساتھ میں بڑی کھل کر باتیں کیا کرتی تھی اور ہمارا آپس میں ہنسی مذاق بھی تھا لیکن میں نے کبھی کبھی محسوس کیا کہ اُس کا مذاق جائز حد سے باہر ہو جاتا ہے۔ ایک بار تو میں نے مجبور ہو کر اسے کہہ دیا کہ وہ اپنی نیت کو صحیح کرے یا میرے گھر نہ آیا کرے۔ وہ پھر بھی کبھی کبھی آ ہی جاتا....

"خدا جانتا ہے کہ میرا چال چلن کتنا پاک تھا اور میں پردہ نشین تھی لیکن ایک بچے کی خاطر مجھے اتنا مجبور کر دیا گیا تھا کہ میں پھسل گئی۔ اولاد پیدا نہ کر سکنا میرا جرم قرار دے دیا گیا اور اس کی مجھے سزا دی جا رہی تھی۔ ایک تو ہر وقت کے طعنے، مجھے منحوس اور بددعائی ہوئی کہا جاتا تھا اور اس کے ساتھ یہ سزا کہ طلاق لو یا سوکن قبول کر کے پرانی جُوتی کی طرح گھر میں پڑی رہو۔ میرا دماغ چل گیا اور ایک روز میں نے دُور پار کی خالہ کے اسی بیٹے کو اپنے خاوند کی جائیداد کا وارث پیدا کرنے کا ذریعہ بنا لیا۔ میں نے جس بیٹے کو جنم دیا تھا وہ میرے خاوند کا نہیں تھا۔ اس کی سزا مجھے فوراً ہی ملنی شروع ہو گئی تھی۔ وہ اس طرح کہ میں نے اپنا مطلب پورا کر کے اس آدمی کے ساتھ تعلق توڑ لیا۔ اُس نے مجھے دھمکیاں

دینی شروع کر دیں کہ وہ میرے خاوند کو اور سب کو بتائے گا کہ میرے بیٹے کا باپ وہ ہے۔ میں چونکہ مجرم تھی اس لئے ڈرتی تھی۔ لیکن میں نے اُس کے ساتھ تعلق توڑے رکھا اور ڈرتی بھی رہی۔ ہر وقت دل کو دھڑکا سا لگا رہتا تھا...

"اڑھائی تین سال اسی ڈر میں گزر گئے کہ میرا راز کھل نہ جائے۔ راز تو نہ کھلا لیکن جو سزا ملی وہ تمہیں سُنا دی ہے.... میں تمہیں صرف یہ کہنا چاہتی تھی کہ طعنے سُن لینا، طلاق لے لینا، صبر کر لینا، لیکن ایک یہ نہ کہنا کہ خدا ہے ہی نہیں اور دوسرے یہ حرکت نہ کر بیٹھنا جو میں نے کی تھی۔"

ایسے لگتا ہے جیسے اس بُڑھیا کو خدا نے میری طرف بھیجا تھا۔ وہ کہتی تھی کہ وہ اسی طرح گھومتے پھرتے کسی نہ کسی کے گھر سے روٹی کھاتے زندگی کے باقی دن پورے کر رہی ہے۔ میں نے شاید کسی وقت کوئی نیکی کی تھی جس کا اجر خدا نے مجھے یہ دیا کہ اس بُڑھیا کو میرے پاس بھیج دیا۔ میں یہ اعتراف کرنے سے شرماؤں گی نہیں کہ میں نے بھی سُسرال کے طعنوں اور اُن کے تھوپے ہوئے الزامات سے تنگ آ کر یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اپنے خاوند کو ایک بچہ دوں گی۔ میں نے بچے کے باپ کا انتخاب بھی کر لیا تھا۔ اگر یہ بُڑھیا ایک یا دو دن اور نہ آتی تو میں نیک چلنی کی سرحد سے نکل جاتی۔ مجھے بڑے صبر آزما وقت سے گزرنا پڑا۔ خدا نے نیک نیتی کا مجھے یہ انعام دیا کہ میرے خاوند نے میری محبت کی خاطر مجھے طلاق نہ دی اور دوسری بیوی بھی نہ لایا۔ تقریباً تین سال اور گزر گئے۔

میرے خاوند کی ایک بہن کے چھ بچے تھے اور وہ بے چاری کسی نہ کسی بیماری میں مبتلا رہتی تھی۔ اُس کا آخری بچہ پیدا ہوا تو چھ سات مہینے بعد اُس نے مجھے اور میرے خاوند کو بلایا اور رو کر کہنے لگی کہ وہ زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہے گی اور ہم اُس کا یہ بچہ گود لے لیں۔ میں اُسی وقت بچے کو اُٹھا کر اپنے گھر لے آئی۔ دو تین مہینے یہ خلش سی رہی کہ یہ بچہ میرے جسم کی پیداوار نہیں اور اس کے جسم میں میرا دودھ نہیں جاتا ہے لیکن پھول سے بچے نے میرے دل میں اپنی ایسی محبت پیدا کر لی کہ میں اُسے اپنے جسم کا حصہ سمجھنے لگی۔

آج میں اس بچے کے بچوں کو کھلا رہی ہوں۔ میرے خاوند کو فوت ہوتے دو سال ہو گئے ہیں۔ صرف اُس کی کمی محسوس کرتی ہوں لیکن اس بچے، اس کی بیوی اور اس کے بچوں نے میری جو خدمت کی ہے وہ بہت بڑا انعام ہے۔

دشمن کا تحفہ

ایدا سوکیو جاپانی سپاہی تھا۔ ہمارے دشمن ملک کے اس سپاہی کا نام چین کی تاریخ میں ہی نہیں، ہم چینی سپاہیوں کے دلوں پر لکھا ہُوا ہے۔ مَیں اُس کے متعلق اس کے سوا کچھ بھی نہیں جانتا کہ وہ جاپانی سپاہی تھا۔

۱۹۳۳ء میں جاپان نے چین کی شمال مشرقی سرحد پر اس قدر طوفانی یلغار کر دی کہ ہماری فوجیں جم نہ سکیں اور بُری طرح بکھر گئیں۔ جاپانی سیاہ آندھی کی طرح بڑھی آ رہی تھی۔ ہماری صرف ایک بٹالین تھی جو ایک پہاڑی پر مورچے سنبھالے ابھی تک لڑ رہی تھی۔ اس کے پاس بھی ایمونیشن ختم ہو گیا تھا۔ ہمارے سپاہیوں کے پاس صرف رائفلیں اور مشین گنیں تھیں اور ان کے مقابلے میں جاپانی اس زمانے کے طیاروں، توپوں اور مارٹر گنوں سے حملہ آور ہُوتے تھے۔ ہمارا چینی بٹالین کمانڈر بار بار سیکٹر کمانڈر کو جھنڈی سے پیغام دے رہا تھا کہ ایمونیشن فوراً پہنچاؤ ورنہ ہمیں پسپا ہونا پڑے گا، لیکن سیکٹر کمانڈر اسے یہ مایوس کن جواب نہیں دینا چاہتا تھا کہ تقریباً ہر بٹالین کے پاس ایمونیشن ختم ہو چکا ہے اور سپلائی لائن بُری طرح کٹ چکی ہے۔

آخر اس بٹالین کو اس مضبوط پوزیشن سے پیچھے ہٹنا پڑا۔ صورتِ حال اس قدر بگڑ چکی تھی کہ سوائے پسپائی کے کوئی چارہ نہ تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ ہم کیرین کا پورا صوبہ اپنے ہاتھوں دشمن کے حوالے کر دیں۔ چینی سپاہی اپنے وطن کے ایک ایک انچ کے دفاع میں کٹ رہے تھے۔ ہمارے سیکٹر کمانڈر نے گوریلا جنگ کے احکام دے دیئے اور کہا کہ جس قدر سپاہی رضا کارانہ طور

پر تیار ہو سکیں اپنی پلٹنوں سے الگ ہو کر تمام علاقے میں پھیل جائیں اور گھات لگا کر دشمن کے ساتھ زندگی اور موت کی انفرادی جنگ لڑیں اور ایمونیشن دشمن کی لاشوں سے حاصل کریں۔ حکم ملتے ہی کوئی ڈیڑھ دو ہزار چینی سپاہی گوریلا جنگ کے لئے دو دو چار چار کی ٹولیوں میں بکھر گئے اور نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ انہوں نے لاشوں سے ایمونیشن اکٹھا کیا اور اپنی اپنی جنگ لڑنے لگے۔

مَیں گوریلا سپاہیوں کی ایک بڑی ٹولی کا کمانڈر تھا۔ ہم ایک وسیع وادی میں گھس گئے۔ یہ وادی ابھی محفوظ تھی۔ رات کے وقت میرا ایک سپاہی اکیلا ہی دشمن کی تلاش میں ہم سے الگ ہو گیا۔ بہت دیر بعد وہ ہانپتا کانپتا میرے پاس آیا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ چند فرلانگ دُور درختوں کے ایک گھنے جھنڈ میں ایمونیشن سے لدا ہُوا ایک جاپانی ٹرک کھڑا ہے۔ نہ اس میں ڈرائیور ہے نہ ہی دُور دُور تک کسی جاپانی سپاہی کا نام و نشان ملتا ہے۔

پہلے تو مَیں نے اس ٹرک کو ہم رنگِ زمیں دام سمجھ کر نظر انداز کر دینے کی سوچی، لیکن اس کے ساتھ ہی مَیں نے محسوس کیا جیسے میں مرنے سے ڈرتا ہوں اور وطن کی آبرو بچانے کے لئے پوری قربانی دینے سے گریز کر رہا ہوں۔ مَیں اُسی وقت اپنی ٹولی کو لے کر درختوں کے جُھنڈ کی طرف چل پڑا۔ وہاں جا کے دیکھا کہ میرے سپاہی کی رپورٹ بالکل صحیح تھی۔ مَیں نے اپنے سپاہی اِدھر اُدھر پھیلا دیئے تاکہ دشمن اچانک ٹوٹ پڑے تو وہ مقابلہ کر سکیں۔ میں خود بھی ایک سمت کو چل پڑا۔ پندرہ بیس قدم کے فاصلے پر میں نے زمین پر ایک کاغذ پڑا دیکھا جو کسی ڈائری سے پھاڑا گیا تھا۔ اس پر جاپانی زبان میں کچھ لکھا ہُوا تھا۔ قریب ہی ایک جھاڑی کی اوٹ میں ایک جاپانی سپاہی کی لاش پڑی ملی۔

میں حیران تھا کہ اس علاقے میں تو کوئی جھڑپ نہیں ہُوئی، پھر یہ سپاہی یہاں کس طرح مرا؟ اور جاپانی جو اس قدر بے پناہ نفری لے کے آتے ہیں، ایمونیشن سے بھرے ہوتے ٹرک کو یہاں کیوں چھوڑ گئے ہیں؟ مجھے خوف سا محسوس ہونے لگا۔ یہ دشمن کی چال ہو سکتی تھی۔ میں ہر لحہ دشمن کے اچانک حملے کا انتظار کرنے لگا۔

میں نے اپنی ٹولی کو وہیں روک کر بیدار رکھا۔ رات گزر گئی اور صبح ہو گئی۔ میں نے کاغذ پر لکھی ہوئی تحریر روشنی میں پھر دیکھی۔ میں جاپانی نہیں پڑھ سکتا تھا۔ لیکن میری ٹولی کے ایک سپاہی نے کاغذ میرے ہاتھ سے لے لیا اور بولا ــــ "میں جاپانی پڑھ سکتا ہوں" ــــ وہ پڑھنے لگا:

چین کے گوریلا سپاہیو!

تمہاری شجاعت کو سلام۔ میں جاپانی سپاہی ہوں۔ ہم تمہارے ملک پر قبضہ کر لینے کے لئے حملہ آور ہوتے ہیں اور تم اپنے ملک کے دفاع میں لڑ رہے ہو۔ تمہارا لڑنے کا ایک مقصد ہے اور ہم بے مقصد جنگ لڑ رہے ہیں۔ میرا بھی ایک دیس ہے مجھے اپنے دیس سے اتنی ہی محبت ہے جتنی تمہیں اپنے دیس سے۔ اپنے دیس کی حفاظت میں جس طرح تم ہماری یلغار کا مقابلہ کر رہے ہو، اس نے میرے دل پر اتنا گہرا اثر کیا ہے کہ میں تمہارے جذبۂ حُب الوطنی پر مر رہا ہوں میں اس ٹرک کا ڈرائیور ہوں۔ تمہارے نام یہ پیغام لکھ کر اس اُمید پر اسے پھینک دیا ہے کہ شاید ہوا سے اُڑتا تم تک پہنچ جائے۔ میں اپنے آپ کو گولی مار رہا ہوں اور ایمونیشن سے لدا ہوا یہ ٹرک تمہاری شجاعت پر تمہیں پیش کر رہا ہوں۔ معلوم ہوا ہے کہ تمہارا ایمونیشن ختم ہو گیا ہے۔ میرے ٹرک میں ایک لاکھ راؤنڈ ہیں۔ میں جاپانی ہوں، لیکن تم یہ ایمونیشن لے کر میرے جاپانی حملہ آور بھائیوں پر فائر کرو گے تو میری روح کو تسکین ہو گی۔ فائر کرو اور اپنے ملک کو دشمن سے بچاؤ۔ مجھے بھی اپنے دیس سے محبت ہے۔

میرا تحفہ قبول کر لینا۔

ایدا اسوکیو ــــ جاپانی ٹرانسپورٹ کور

کوانٹنگ آرمی ۳۰۔ مارچ ۱۹۴۲ء

یہ سُن کر میری ٹولی کے دو سپاہیوں نے پہلا کام یہ کیا کہ اس جاپانی

کی لاش کو اٹھایا اور اسے پیچھے لے گئے۔ باقی سپاہیوں نے دوسری گوریلا پارٹیوں سے رابطہ قائم کیا اور رات کے وقت ٹرک سے ایمونیشن اتارا اور اپنی پلٹنوں میں تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ یہ کام آسان نہ تھا کیونکہ دشمن کا دباؤ بڑھ گیا تھا۔ ہماری فوجیں پسپا ہو رہی تھیں اور چپے چپے پر دشمن کی حکمرانی تھی۔ ہر سُو گولے پھٹ رہے تھے۔ گوریلا سپاہی ایمونیشن کی پیٹیاں لے لے کر رات کے اندھیرے میں پتھروں پر رینگ رینگ کر اپنی پلٹنوں کو ایمونیشن پہنچاتے تھے۔ متعدد گوریلا سپاہی اس کٹھن مہم میں مارے بھی گئے، لیکن ایک جاپانی سپاہی کے تحفے نے ہماری صفوں میں اتنی جان ڈال دی کہ ہماری سپاہ جم گئی اور جاپانی یلغار کو کمک پہنچنے تک ہم نے روکے رکھا۔

ایدا سوکیو کو ہم نے اپنے ایک قریبی گاؤں ماچیا میں مکمل فوجی احترام اور اعزاز سے دفن کر دیا اور وہاں کے واحد پرائمری سکول کا نام اس کے نام پر "ایدا پرائمری سکول" رکھ دیا۔ آج بھی یہ سکول اسی نام سے مشہور ہے اور ماچا کے لوگ اب بھی ایدا کی برسی مناتے ہیں اور عورتیں ایدا کے نام کے گیت گاتی ہیں۔

چھوٹی بہن کا پگلا بھائی

ایک بھائی میرے سامنے آگیا ہے۔ وہ کسی عصمت فروش خاندان سے تعلق نہیں رکھتا لیکن یہ خاندان شریف بھی نہیں تھا۔ میں آپ کو یہ کہانی اس بھائی کی اجازت سے سنا رہا ہوں۔ یہ واقعات دس سال پہلے کے ہیں میں رائٹروں کی طرح نہیں لکھ سکتا۔ واقعات لکھ کر بھیج رہا ہوں۔ میری تحریر کو آپ خود سیدھا کر لیں۔

وہ ایک معمولی سا اور تھوڑا سا پڑھا ہوا درمیانہ درجے کا خاندان تھا۔ اس میں ایک باپ تھا۔ میں اس کا بدلا ہوا نام شیخ علی محمد لکھ دیتا ہوں۔ اُس کی بیوی تھی اور اولاد میں تین لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔ شیخ علی محمد کی جنرل سٹور کی دکان تھی۔ شیخ علی محمد ڈنڈی مارنے والا دکاندار تھا۔ اُس کی اولاد سکولوں میں پڑھ رہی تھی۔ میٹرک سے آگے کوئی بھی نہ پڑھا۔ بڑے بیٹے نے میٹرک پاس کیا تو باپ کے ساتھ دکان میں کام کرنے لگا۔ اس سے چھوٹی ایک بہن تھی۔ اُس نے میٹرک پاس کیا تو گھر بیٹھ گئی۔

شیخ علی محمد کی دکان کے متعلق مشہور ہونے لگا کہ اس دکان سے باہر کی چیزیں اور کپڑا بھی مل جاتا ہے۔ اس خاندان کے ساتھ میری رشتہ داری تھی۔ میں نے بھی ان کی دکان سے باہر کی استری اور ایک جوسر خریدا تھا۔ اُن دنوں پاکستان میں یہ چیزیں بہت کم نظر آتی تھیں۔ ان چیزوں کی بدولت شیخ علی محمد کی دکان مشہور ہوتی چلی گئی۔ یہ خاندان پہلے ہی خوشحال تھا لیکن اب یہ خاندان امیر ہو گیا۔

پھر دکانداروں نے سرگوشیوں میں کہنا شروع کر دیا کہ شیخ علی محمد باہر کی چیزیں سمگل کرتا ہے۔ ہم یہ دیکھ رہے تھے کہ اس خاندان کے افراد نے اچھے طریقوں سے امیری کی نمائش شروع کر دی تھی۔ اس گھر میں دو لڑکیاں تھیں۔ بڑی اُس وقت بیس سال سے کچھ اُوپر کی ہوگئی تھی اور چھوٹی سولہ سترہ سال کی تھی۔ ان کی ماں بھی تھی جس کی عمر ڈھل گئی تھی۔ وہ سادگی میں رہتی تھی اور باہر پرانی طرز کے سفید برقعے میں جایا کرتی تھی۔ وہ اب برقعے کے بغیر باہر نکلنے لگی۔ اس کی سادگی ختم ہوگئی اور وہ جوان لڑکیوں جیسے کپڑے پہننے لگی جن کے رنگ شوخ ہوتے تھے۔ اُس کے بولنے کا انداز بالکل بدل گیا۔ نیا انداز مصنوعی تھا۔

چھوٹی لڑکی نے کچھ شرم وحیا رہنے دیا لیکن بڑی لڑکی نے شوبازی کے ایسے ایسے مظاہرے شروع کر دیئے جن پر لوگ ہنستے بھی تھے اور افسوس بھی کرتے تھے کہ حرام کے پیسے نے پردہ دار عورتوں کو بے پردہ کر دیا ہے۔

ان لڑکیوں کے تین بھائی تھے۔ بڑا تقریباً چوبیس سال کا تھا۔ اس سے چھوٹے کی عمر اٹھارہ سال ہوگی۔ سب سے چھوٹا چودہ پندرہ سال کا تھا۔ بڑا اور سب سے چھوٹا لڑکا امیرزادے بن گئے۔ درمیان والا بھائی جس کو میں اصلی نام کی بجائے صدیق کہوں گا، ذہنی طور پر نارمل نہیں لگتا تھا۔ وہ پاگل بھی نہیں تھا۔ وہ آٹھویں جماعت سے آگے نہیں پڑھ سکا تھا۔ اُس کی حرکتیں اس طرح تھیں کہ بات خواہ رونے کی ہو لیکن وہ ہنستا تھا اور اُسے لوگ ہر وقت ہنستا اور مسکراتا ہوا دیکھتے تھے۔ کوئی بات نہیں سمجھتا تھا۔ اٹھارہ سال عمر میں بھی وہ چھوٹے بچوں کے ساتھ کھیلتا تھا۔ باپ اور بھائی اُسے ڈانٹ ڈپٹ کرتے رہتے تھے جس کا اُس پر ذرا سا بھی اثر نہیں ہوتا تھا۔

وہ دکان پر بھی نہیں جاتا تھا لیکن اُسے کوئی کام کہو تو انکار نہیں کرتا تھا۔ مثلاً محلے کا کوئی بھی آدمی اُسے برتن اور پیسے دے کر کہتا کہ دُودھ لا دو تو وہ برتن اور پیسے لے کر بازار کی طرف دوڑ پڑتا تھا لیکن اس کی گارنٹی نہیں

ہوتی تھی کہ وہ دُودھ لے آتے گا۔ دوڑتے دوڑتے راستے میں اُسے بچے کھیلتے نظر آجاتے تو وہ انہیں دیکھنے رُک جاتا، یا کوئی کھیل تماشہ ہو رہا ہوتا تو وہ دیکھنے میں محو ہو جاتا۔ اپنے گھر میں وہ نوکر لگتا تھا۔ اُس کے کپڑے صاف سُتھرے نہیں ہوتے تھے۔ بالوں میں کنگھی کبھی کبھی کیا کرتا تھا۔ اس کے گھر والے کہتے تھے کہ بعض اوقات وہ کہیں بیٹھ جاتا یا رُک جاتا اور اپنے کسی خیال یا تصوّر میں محو ہو جاتا تھا۔ اُس کی یہ کیفیت دو تین گھنٹے رہتی تھی۔ اس میں وہ سنجیدہ ہو جاتا تھا۔ وہ سنجیدہ ہوتا یا غیر سنجیدہ، وہ اپنی دنیا میں زندگی گزار رہا تھا۔

ایک روز شیخ علی محمد کی دکان پر پولیس کا چھاپہ پڑا۔ سارا بازار تماشہ دیکھنے کے لئے اکٹھا ہو گیا۔ پولیس کے ساتھ کسٹم کے افسر تھے۔ شیخ علی محمد اور اُس کے بڑے بیٹے کو دکان سے اُن کے گھر لے گئے۔ پولیس بہت دیر اُس کے گھر میں موجود رہی۔ بعض لوگ کہتے تھے کہ اُن کے گھر کی بڑی سخت تلاشی ہوئی ہے اور بعض کہتے تھے کہ شیخ علی محمد نے پولیس کو بہت سارا مال دے کر جان چھڑانے کا انتظام کر لیا ہے۔

پولیس شیخ علی محمد اور اُس کے بڑے بیٹے کو ساتھ لے گئی۔ شیخ علی محمد کی بیوی گھر گھر جاتی اور روتی تھی۔ کہتی تھی کہ دشمنوں نے "ہم شریفوں" کو ذلیل کرانے کے لئے پولیس کو جھوٹی رپورٹ دی ہے۔ اس میں کسی کو شک نہیں تھا کہ شیخ علی محمد اور اُس کا بڑا بیٹا سمگلنگ کا سامان رکھنے اور بیچنے کے جرم میں پکڑے گئے ہیں۔ سب کو یہی توقع تھی کہ انہیں قید کی سزا ملے گی لیکن چار پانچ دنوں بعد باپ بیٹا گھر آ گئے۔ لوگ کہتے تھے کہ ضمانت پر آتے ہیں لیکن وہ بالکل ہی آ گئے تھے۔ کیس کورٹ میں گیا ہی نہیں تھا۔

اس کے بعد شیخ علی محمد سمگلروں کا ساتھی بن گیا بلکہ پکا سمگلر بن گیا۔ کبھی کبھی رات کو اُس کے گھر تک ایک ٹرک آکر رُکتا اور اس سے سامان اتارا جاتا اور سارا سامان جس میں فریج اور ٹی۔ وی سیٹ بھی ہوتے تھے، شیخ علی محمد کے گھر میں غائب ہو جاتا۔ یہ کاروبار رات کو چلتا تھا۔ سامان تھوک کے حساب سے

خریدنے والے آتے تھے۔ تین چار راتوں میں سامان ختم ہو جاتا تھا۔

تیسرے چوتھے مہینے شیخ علی محمد کہیں چلا جاتا اور بیس پچیس روز یا ایک ماہ بعد آتا تھا۔ چند دنوں بعد رات کو ایک ٹرک آتا اور سامان اتار کر چلا جاتا تھا۔ یہ سلسلہ سات آٹھ سال چلتا رہا۔ اس عرصے میں شیخ علی محمد کا خاندان اتنا امیر ہو گیا کہ دولت ان سے سنبھالی نہیں جاتی تھی۔ لڑکیاں تو دونوں ہی آزاد ہو گئی تھیں لیکن بڑی تو شرم وحیا اور اخلاق کی حدود سے بہت دُور چلی گئی تھی۔ اُسے کبھی کبھی رات کو ایک کار میں گھر سے جاتے دیکھا گیا تھا۔

گناہ زمین کے نیچے جا کر کرو پھر بھی چھپا نہیں رہتا۔ شیخ علی محمد اپنے خاندان کو جس دنیا میں لے گیا تھا وہاں کسی کے گناہ چھپے نہیں رہ سکتے۔ اوچھے لوگ اپنے بعض گناہوں کو فخر سے بیان بھی کیا کرتے ہیں۔ مثلاً شیخ علی محمد محلّے برادری کی شادی یا ماتم کی محفل میں بیٹھا ہوتا تو اپنے اثر ورسوخ کا رُعب جماتا اور اپنی بڑی بیٹی کا بھی ذکر کرتا کہ وہ بڑے لوگوں کی پارٹیوں اور تقریبات میں بلائی جاتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ شیخ علی محمد کا اثر ورسوخ بہت تھا۔ سرکاری دفتروں میں جن کے کام رُکے ہوتے تھے وہ کرا دیتا تھا۔ تھانے میں کسی کا کوئی کام ہو تو وہ کرا دیتا تھا۔ محلّے اور برادری میں کوئی مالی مدد کا مستحق ہو تو اُس کی مالی مدد کرتا تھا لیکن اپنی دولت مندی کے چرچے بہت کرتا تھا۔ سب جانتے تھے کہ اُسے سمگلنگ نے دولت مند بنایا ہے لیکن لوگ باتیں کرنے کے سوا اور کیا کر سکتے تھے۔ اُسے پکڑنے والے اُس کے ہاتھ میں تھے۔

یہ کوئی نئی بات نہیں کہ اتنی زیادہ دولت انسان کی عقل پر پردہ ڈال دیتی ہے اور اگر دولت حرام کی ہو تو انسان بالکل ہی ننگا ہو جاتا ہے۔ آپ اس دولت کے مظاہرے اپنے محلّے اور آبادی میں دیکھتے رہتے ہیں۔ یہی حال شیخ علی محمد کے خاندان کا ہُوا۔ یہ بھی کوئی نئی بات نہیں کہ حرام کی دولت اور رشوت لازم وملزوم ہیں۔ شیخ علی محمد کے کاروبار میں رشوت کے ریٹ خاصے زیادہ ہوتے ہیں اور رشوت صرف نقد نہیں ہوتی بلکہ قیمتی تحائف کی صورت میں

بھی ہوتی ہے اور ان تحائف میں عورت بھی شامل ہوتی ہے۔ شیخ علی محمد کی بیٹی کسی کار میں جاتی تھی اور بڑے لوگوں کی تقریبوں میں شامل ہوتی تھی تو وہ رشوت کے طور پر جاتی تھی۔ چھوٹی لڑکی ابھی بچی ہوتی تھی۔ دونوں بہنیں اچھی شکل وصورت کی تھیں۔

بڑا اور چھوٹا بیٹا تو بے لگام شہزادے بن گئے تھے۔ یہ پچھلی حکومت کے دور کا واقعہ ہے جب شراب آسانی سے مل جاتی تھی۔ ان لوگوں کے لئے شراب کی اب بھی کمی نہیں تھی۔ دونوں اکثر شراب پیتے رہتے۔ ہر کسی پر رُعب جماتے اور لڑائی جھگڑا کرنے کے موڈ میں رہتے تھے۔ باپ نے انہیں کار لے دی تھی جو وہ گلیوں میں بھی چلاتے رہتے تھے۔

درمیانے بھائی کی حالت وہی رہی جو پہلے ہُوا کرتی تھی۔ بعض اوقات ایسے پتہ چلتا تھا جیسے اس خاندان کے ساتھ اس کی کوئی رشتے داری نہیں اور اگر کوئی تعلق ہے تو یہی ہوسکتا ہے کہ وہ اس گھر کا نوکر ہے۔ پہلے کی طرح وہ میلے کچیلے کپڑے پہنے رکھتا تھا اور بالوں میں کنگھی کبھی کبھی کرتا تھا۔ جب کبھی خیال آتا تو شیو کرا لیتا ورنہ اُس کی داڑھی اکثر بڑھی ہوتی تھی۔ پہلے کی ہی طرح وہ ہنستا ہی رہتا تھا۔ اُس کی بعض حرکتیں پاگلوں جیسی ہوتی تھیں لیکن وہ پاگل نہیں تھا۔ مجھے اچھی طرح پتہ تھا کہ دونوں بھائی اُس کے ساتھ اچھوتوں جیسا سلوک کرتے تھے۔ وہ کار چلا لیتا تھا لیکن بھائی کوشش کرتے تھے کہ وہ کار کو ہاتھ بھی نہ لگائے۔ اُس کے ساتھ باپ کا سلوک بھی اچھا نہیں تھا۔

ایک شام اس طرح ہُوا کہ ماں نے اپنی چھوٹی بیٹی سے کہا کہ فلاں افسر کا بلاوا آیا ہے لیکن وہ تمہیں بلا رہا ہے۔ بہتر ہے کہ تم چلی جاؤ۔

"نہیں امی!" ——— لڑکی نے کہا ——— "تم جانتی ہو کہ میں اس طرح کبھی نہیں گئی۔ میں نہیں جاؤں گی۔"

ماں نے اُسے بڑی اچھی طرح سمجھایا کہ اس کا جانا بہت ضروری ہے اور اگر وہ نہ گئی تو کاروبار ٹھپ ہو جائے گا اور ایسا چھاپہ پڑے گا کہ گھر کے سارے مرد گرفتار ہو جائیں گے اور جو مال گھر میں اور دوکان میں پڑا ہے وہ ضبط ہو

جائے گا۔

"تمہاری بڑی بہن ہنسی خوشی جاتی ہے اور تحفے لے کر آتی ہے"— ماں نے کہا — "ایک بار جا کر دیکھو، تم خوش ہو جاؤ گی"۔

لڑکی نے جس کو میں اصلی نام کی بجائے رابعہ لکھوں گا، پھر بھی انکار کیا۔ وہ چونکہ ابھی تک رشوت کے طور پر کہیں نہیں گئی تھی اس لئے وہ جھجکتی اور شرماتی تھی۔ اُس وقت اس کی عمر اکیس بائیس سال ہو گئی تھی۔ ویسے وہ بڑی بہن کی طرح آزاد خیال تھی اور اُس میں بھی پورے خاندان کی طرح شو بازی اور نمائش پسندی تھی۔ اُس کے کردار کی بُنیاد کمزور تھی اس لئے وہ ماں کی باتوں میں آگئی اور ایک افسر کے گھر جانے کے لئے تیار ہو گئی۔

یہ بات خاص طور پر ذہن میں رکھیں کہ شیخ علی محمد کی تمام اولاد جوان ہو گئی تھی لیکن کہیں سے بھی اس اولاد کے لئے رشتے کا پیغام نہیں آتا تھا۔ اس گھر کو آپ دولت خانہ کہہ سکتے ہیں لیکن میں ساری کہانی صرف ایک لفظ میں سمیٹ سکتا ہوں کہ یہ دولت خانہ دراصل کنجر خانہ تھا۔ یہ لفظ استعمال کر کے مجھے کسی اور تشریح یا بیان کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

شام کے بعد کا وقت تھا جب رابعہ ماں کے کہنے پر کسی افسر کی کوٹھی میں جانے کو تیار ہو چکی تھی لیکن ایک مسئلہ یہ پیدا ہو گیا کہ کار موجود تھی، کار چلانے والا کوئی بھائی گھر میں نہیں تھا۔ اتنے میں رابعہ کا پگلا بھائی جسے میں صدیق لکھ رہا ہوں آ گیا۔ ماں نے اُسے ایک کوٹھی کا اتہ پتہ سمجھا کر کہا کہ بہن کو وہاں چھوڑ آؤ، اسے اس کی سہیلی نے بلایا ہے۔ اُس وقت صدیق کی عمر پچیس چھبیس سال ہو چکی تھی۔ وہ ماں کی بات سن کر حسبِ عادت ہنسنے لگا اور بولا، چلو میں بھی سیر کر آؤں گا۔ ماں نے اُسے ڈانٹ کر کہا کہ تم اندر نہ جانا۔ بہن کو اتار کر آجانا، وہ لوگ خود اسے واپس بھیج دیں گے۔

رابعہ اپنے بھائی صدیق کے ساتھ چلی گئی۔ راستے میں بہن بھائی نے آپس میں کوئی بات نہ کی۔ بہن اپنے اس بھائی کو اس قابل نہیں سمجھتی تھی کہ اس کے ساتھ کوئی بات کرے۔ بہن کی خاموشی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ پہلی بار

رشوت کے طور پہ جا رہی تھی اور ڈر رہی تھی۔

انہیں کوٹھی جلدی مل گئی۔ صدیق کار کوٹھی کے اندر لے گیا۔ ایک نوکر باہر نکلا اور کار میں رابعہ کو دیکھ کر اندر چلا گیا۔ اندر سے تقریباً پچاس برس کی عمر کا ایک آدمی نکلا۔ صدیق اور رابعہ کار سے نکل کر کار کے قریب ہی کھڑے تھے۔ کوٹھی سے باہر آنے والا آدمی ہاتھ آگے کر کے رابعہ کی طرف آیا اور ہنستے ہوئے بولا کہ میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔ اُس نے ہاتھ اس لئے آگے بڑھایا تھا کہ رابعہ اس سے ہاتھ ملاتے گی لیکن رابعہ نے اپنا ہاتھ آگے نہ کیا۔ وہ شخص رابعہ کے بالکل سامنے آگیا اور اُس نے ہاتھ رابعہ کی طرف بڑھایا۔ رابعہ نے اپنے بھائی صدیق کی طرف دیکھا۔ اُس وقت رابعہ کے چہرے پر پریشانی کا تاثر تھا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ اس شخص کے ساتھ ہاتھ نہیں ملانا چاہتی یا اپنے بھائی کی اجازت چاہتی ہے۔

وہ صدیق جسے میں پاگل لکھ رہا ہوں اور جسے ہر کوئی پاگل سمجھتا تھا، تیزی سے آگے بڑھا۔ اُس نے بڑے غصے سے اُس شخص کے ہاتھ پہ زور سے ہاتھ مارا اور اُسے دھکیل کر پیچھے کر دیا۔ پھر اُس نے اپنی بہن کو بازو سے پکڑا اور کار میں بٹھا کر خود سٹیئرنگ پر بیٹھا اور کار سٹارٹ کر کے وہاں سے نکل آیا۔ راستے میں اُس نے کار روک لی۔

"کیا تم یہاں نہیں آنا چاہتی تھیں؟" — اُس نے رابعہ سے پوچھا۔

"نہیں" — رابعہ نے کہا — "مجھے ماں نے مجبور کیا تھا" — اور اُس کے آنسو نکل آتے۔

"اب تمہیں کوئی مجبور نہیں کرے گا" — صدیق نے کہا۔

جب صدیق اور رابعہ گھر میں داخل ہوتے اُس وقت اُن کا باپ گھر آ چکا تھا اور بڑا بھائی بھی گھر میں تھا۔ صدیق اور رابعہ کو دیکھ کر وہ حیران ہوتے کہ یہ اتنی جلدی کیوں آگئی ہے۔ ماں نے اُن سے جلدی واپس آ جانے کی وجہ پوچھی۔

"رابعہ آئندہ کسی کے پاس نہیں جاتے گی" — صدیق

نے کہا۔

"یہ نہیں جاتے گی تو تم سب اپنے باپ کے ساتھ جیل میں جاؤ گے"

— ماں نے کہا۔

"جہنم میں جاؤ" — صدیق نے کہا — "رابعہ کہیں نہیں جاتے گی"

"یہ پاگل سب کو مرواتے گا" — باپ نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

شیخ علی محمد اور اُس کے بڑے بیٹے نے صدیق کو بہت مارا پیٹا۔ رابعہ نے اُسے چھڑانے کی کوشش کی تو بڑے بھائی نے دو چار تھپڑ اُسے بھی جڑ دیتے۔

اس کے بعد اس گھر میں اسی طرح کے ہنگامے شروع ہو گئے۔ رابعہ ماں باپ سے باغی ہو گئی لیکن پٹائی صدیق کی ہوتی تھی۔ بھائی اُسے بہت مارتے پیٹتے تھے۔ سب حیران تھے کہ رابعہ جو پوری طرح آزاد ہو چکی تھی، باغی کس طرح ہو گئی ہے لیکن خدا جسے چاہے ایمان کی روشنی دے دے۔ صدیق پہلے سے زیادہ پگلا ہو گیا۔ یہ سلسلہ کم و بیش ڈیڑھ سال چلا۔ اس ڈیڑھ برس میں یوں ہوتا رہا کہ صدیق تیسرے چوتھے روز ہمارے گھر آجایا کرتا۔ میری ماں، میں اور میری چھوٹی بہن اسے ایک نیکی سمجھ کر صدیق کے ساتھ پیار محبت کی باتیں کرتے اور اُسے اپنے پاس بٹھا کر کھانا بھی کھلا دیا کرتے تھے۔ میں ذاتی طور پر اسے ایک نیکی اور صدیق کو مظلوم سمجھتا تھا۔ ہمیں اصل بات کا علم ہو گیا تھا۔ رابعہ بھی کئی دفعہ ہمارے گھر آئی تھی اور میری بہن کے ساتھ باتیں کر کے روتی بھی رہی تھی۔

ڈیڑھ سال بعد خدا نے اس خاندان کی طرف توجہ دی اور اُس کی بے آواز لاٹھی چلی۔ معصوموں کو تنگ کرنے کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔ ایک روز اطلاع ملی کہ شیخ علی محمد اُس کی بیوی اور بڑا بیٹا راولپنڈی جاتے ہوتے کار کے حادثے میں مارے گئے ہیں۔ رات کا وقت تھا اُن کی کار ٹرک سے ٹکرا گئی تھی۔

چھوٹا بیٹا اس حد تک آوارہ ہو چکا تھا کہ کئی کئی دن گھر سے غائب رہتا

تھا جب اُس کے ماں باپ اور بھائی کی لاشیں گھر میں آئیں اُس وقت بھی وہ گھر سے غائب تھا۔ وہ اُس وقت گھر آیا جب مرنے والوں کے قُل ہو چکے تھے۔

ڈیڑھ دو مہینے بعد یہ بھائی ایسا غائب ہُوا کہ پھر نظر نہ آیا۔ پیچھے صدیق اور رابعہ رہ گئے۔ ان دونوں کے متعلق سب کو پتہ چل چکا تھا کہ یہ ماں باپ اور بھائیوں کی لاش پر نہیں چلے۔ ان کے رشتہ دار تھوڑے سے ہی تھے جن میں ایک مَیں بھی تھا۔ سب نے کہا کہ صدیق اور رابعہ کو سنبھال لیا جاتے۔ رابعہ میرے گھر کئی بار آئی تھی اور یہ لڑکی مجھے شکل وصورت کے علاوہ کردار کے لحاظ سے بھی اچھی لگتی تھی۔ ایسا انتظام ہو گیا کہ میری شادی اس کے ساتھ کر دی گئی۔ مجھے رابعہ کے چال چلن کے متعلق پوری طرح یقین نہیں تھا۔ حرام کی دولت نے اُسے بھی قابلِ اعتراض حد تک آزاد کر دیا تھا لیکن میں نے ایک نیکی کے طور پر یہ سوچا کہ اگر میں نے اس لڑکی کو قبول نہ کیا تو یہ ذلیل وخوار ہو جائے گی۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ اس کا رشتہ قبول کرنے کو کوئی بھی تیار نہ تھا اور میں نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ اس لڑکی کو خراب کرنے والے بہت تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے میری ماں نے روکا تھا لیکن میں نے ایک نیکی سمجھ کر رابعہ کے ساتھ شادی کر لی۔

رابعہ نے مجھ پر ثابت کر دیا کہ وہ شریف لڑکی ہے اور میں نے اُس کے ساتھ جو نیکی کی ہے اس کا صلہ وہ پوری طرح وفادار بن کر ساری عمر دیتی رہے گی۔ میری ماں بیمار رہنے لگی تھی۔ رابعہ نے جس طرح اس کی خدمت اور دیکھ بھال کی وہ میں آپ کو سناؤں تو آپ شاید یقین نہیں کریں گے۔ میری اپنی سگی بہن اپنی ماں کی اتنی زیادہ خدمت نہیں کرتی تھی۔ رابعہ کو صرف ایک دُکھ تھا کہ اُس کا بھائی صدیق اکیلا رہ گیا تھا۔

میں صدیق کو اپنے گھر لے آتا تھا لیکن یہی پاگل صدیق اتنا غیرت مند نکلا کہ وہ میرے گھر آنا پسند نہیں کرتا تھا۔ اس سے پہلے وہ ہمارے گھر سے کھانا بھی کھا جاتا تھا لیکن اب کہتا تھا کہ وہ اپنے بہنوئی اور بہن پر بوجھ نہیں

بننا چاہتا۔ تین مہینے گزرے تو خدا نے ایسا سبب بنا دیا کہ صدیق کو ہمارے ساتھ رہنا پڑا۔ سبب یہ بنا کہ صدیق کا چھوٹا بھائی جو بالکل ہی غائب ہو گیا تھا، واپس آ گیا اور اُس نے در پردہ مکان بیچ ڈالا اور دکان بھی بمع مال فروخت کر دی اور وہ اچھی خاصی دولت سمیٹ کر غائب ہو گیا۔ وہ دو تین غنڈوں کو ساتھ لایا تھا جنہوں نے صدیق کو مار پیٹ کر گھر سے نکال دیا۔

یہ بہت بڑا جرم تھا جو صدیق کا بھائی کر گیا تھا۔ جائداد میں صدیق اور رابعہ کا حصہ بھی تھا۔ مجھے بعض حضرات نے مشورہ دیا کہ میں اُس کے خلاف مقدمہ دائر کروں لیکن مالی لحاظ سے مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی اور نہ ہی میں اس جھنجھٹ میں پڑنا چاہتا تھا۔ رابعہ نے بھی مجھے یہی مشورہ دیا کہ جو کچھ ہو چکا ہے اُسے دل سے اُتار دو۔ وہ سب حرام کی جائداد تھی۔ میں نے رابعہ کا مشورہ قبول کر لیا لیکن صدیق کی حالت دن بدن بگڑنے لگی۔ اب اُس نے ہنسنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ زیادہ تر چُپ چاپ رہتا تھا۔ اُس نے کچھ ایسی حرکتیں بھی شروع کر دی تھیں جس سے پتہ چلتا تھا کہ اُس کے دماغ پر بہت زیادہ اثر ہُوا ہے اور اب وہ سچ مچ پاگل ہو گیا ہے۔ وہ کسی کو تنگ نہیں کرتا تھا۔ اکثر چُپ چاپ رہتا یا رونے لگتا یا ہاتھوں سے اوٹ پٹانگ اشارے کرنے لگتا، جیسے تصور میں کسی کے ساتھ باتیں کر رہا ہو۔

اس ذہنی حالت کے علاوہ صدیق ایک عجیب سے مرض میں مبتلا ہو گیا۔ دوسرے تیسرے دن وہ پیٹ پر ہاتھ رکھ کر دوہرا ہو جاتا۔ اُس کا رنگ زرد ہو جاتا اور ڈیڑھ دو گھنٹے بعد اُس کی یہ کیفیت ٹھیک ہو جاتی۔ ایک مہینے بعد اُسے تشنج کے دَورے پڑنے لگے۔ اُس کے ہاتھ مُڑ جاتے۔ چہرہ کھنچ جاتا اور جسم اکڑ جاتا۔ یہ دَورہ ایک مہینے میں دو بار پڑا۔ اس سے ہمیں بہت فکر پیدا ہُوا۔ رابعہ اُسے دیکھ کر روتی تھی۔

میں اتنا زیادہ پڑھا لکھا آدمی نہیں تھا کہ اُس کے مرض کو سمجھ سکتا۔ میری ماں کہتی تھی کہ اس پر کوئی آسیبی اثر ہے۔ ماں کے کہنے پر میں اور رابعہ اُسے ایک عامل کے پاس لے گئے۔ عامل نے بھی کہا کہ اس پر آسیب کا اثر ہے۔ اس

نے دو تین تعویذ دیتے اور کچھ ٹوٹکے بھی بتاتے مگر کچھ افاقہ نہ ہوا۔ اس کے بعد ہم اُسے مزاروں اور خانقاہوں پر لے جاتے رہے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ صدیق نے پہلے کی طرح پھر ہنسنا شروع کر دیا۔ وہ دراصل ہماری حماقتوں پر ہنستا تھا لیکن اُس کے دَورے ویسے ہی رہے۔

اس ذہنی کیفیت کے باوجود صدیق میرے دل کو بہت اچھا لگتا تھا۔ اُس کا یہ کارنامہ معمولی نہیں تھا کہ اُس نے اپنی بہن کی عصمت بچائی تھی۔ اگر وہ بہن کو اُس کوٹھی سے واپس نہ لے آتا تو وہ اپنی بڑی بہن کی طرح تہذیب کے پردے میں باقاعدہ عصمت فروش بن جاتی۔ میں نے آپ کو بتایا نہیں کہ اُس کی بڑی بہن کہاں گئی تھی؛ وہ ماں باپ کی زندگی میں ہی کسی کے ساتھ غائب ہو گئی تھی۔ باپ نے اُسے حسبِ معمول کسی کی کوٹھی میں بھیجا تھا لیکن وہ واپس نہ آئی۔ پتہ چلا کہ وہ اس کوٹھی تک پہنچی ہی نہیں تھی۔ اڑتی اڑتی خبر سُنی تھی کہ وہ کسی سمگلر کے ساتھ چلی گئی ہے۔

ہمیں ایک سیانا آدمی مل گیا۔ میں نے اُس کے آگے صدیق کا مسئلہ رکھا۔ اُس نے صدیق کو دیکھا اور اُس کے ساتھ اِدھر اُدھر کی باتیں کیں۔ اس آدمی نے مجھے ایک ڈاکٹر کا نام بتایا اور کہا کہ اُس کے پاس لے جاؤ۔ میں صدیق کو لے گیا۔ ڈاکٹر نے صدیق کو اچھی طرح دیکھ بھال کر کچھ دوائیاں لکھ دیں۔ ان کا اثر یہ ہُوا کہ وہ زیادہ وقت سویا رہتا تھا۔ جب وہ بیدار ہوتا تو پھر اُس کی ذہنی کیفیت ویسی ہی ہو جاتی تھی اور تشنج کا دَورہ بھی پڑ جاتا تھا جسے ہر کوئی مرگی کہتا تھا۔

یہ ڈاکٹر صاحب فوت ہو چکے ہیں۔ بہت بوڑھے تھے۔ اب تو اُن جیسا ڈاکٹر کہیں نظر نہیں آتا۔ اُنہوں نے دو مہینے دوائیاں بدل بدل کر دیں۔ آخر ایک روز اُنہوں نے صدیق کو باہر بھیج کر مجھے اپنے پاس بٹھا لیا۔ کہنے لگے کہ صدیق میں کوئی جسمانی نقص نہیں، یہ نفسیاتی معاملہ معلوم ہوتا ہے۔

"اس کے متعلق مجھے بچپن سے اب تک بتاؤ"—— ڈاکٹر صاحب نے کہا اور کچھ اور باتیں پوچھیں۔

میں نے انہیں تفصیل سے بتایا تھا کہ صدیق نے کیسی زندگی گزاری ہے اور اس کے خاندان میں کیسا انقلاب آیا تھا اور یہ خاندان کس طرح ختم ہو گیا ہے۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو یہ بھی بتایا کہ صدیق نے کس طرح اپنی چھوٹی بہن کو تمام عمر کی تباہی سے بچایا تھا اور ڈیڑھ سال اس کے باپ اور بھائیوں نے اسے کس طرح مارا پیٹا اور دھتکارے رکھا تھا۔

ڈاکٹر نے دلچسپی سے اتنی لمبی کہانی سنی اور کہنے لگے کہ یہ دوائیوں کا کیس نہیں، بلکہ اُنہوں نے غصے سے کہا کہ ہم انہیں یہ قصہ پہلے سنا دیتے تو اب تک صدیق ٹھیک ہو چکا ہوتا۔

"اس کا دماغ بالکل ٹھیک ہے"۔۔۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا۔۔۔"اس کا ذہن بگڑا ہُوا ہے۔ اگر یہ دماغی مریض ہوتا تو اپنی بہن کی عصمت کا اسے ذرا سا بھی خیال نہ ہوتا اور یہ اپنے دونوں بھائیوں کی طرح آوارہ اور غنڈہ ہوتا"۔

ڈاکٹر صاحب نے دوسرے روز صدیق کو تقریباً ایک گھنٹہ اپنے پاس بٹھائے رکھا۔ اُسے باہر بھیج کر اُنہوں نے مجھے بلایا اور کہنے لگے کہ صدیق کی شادی کا بندوبست کرو۔

یہ کام ممکن نہیں تھا۔ اُس کی عمر ستائیس اٹھائیس سال ہو گئی تھی۔ ہم نے اُس کی شادی کی سوچی ہی نہیں تھی۔ وہ جس طرح کا آدمی تھا وہ میں آپ کو بتا چکا ہوں۔ لوگ اُسے سچ مچ کا پاگل کہتے تھے۔ میری اپنی بہن تھی جو شادی کی عمر تک پہنچ گئی تھی۔ اُس کے رشتے کے پیغام آ رہے تھے۔ ابھی ہم نے فیصلہ نہیں کیا تھا لیکن میں اپنی بہن کا رشتہ صدیق کو نہیں دے سکتا تھا۔ میں اتنی بڑی قربانی دینے کے لئے تیار نہیں تھا۔ یہ فیصلہ اب مجھے ہی کرنا تھا۔ میری والدہ دو مہینے پہلے فوت ہو گئی تھیں۔ والد صاحب کو فوت ہوتے بارہ سال گزر گئے تھے۔

میں نے گھر آ کر رابعہ کو بتایا کہ ڈاکٹر صاحب نے کیا مشورہ دیا ہے۔ رابعہ کو بہت دُکھ ہُوا۔ اُسے معلوم تھا کہ صدیق کو کوئی بھی اپنی بیٹی کا رشتہ نہیں دے گا۔ میں نے رابعہ سے کہا کہ صدیق کی حالت خراب ہوتی جا رہی ہے ورنہ

اسے میں اپنی بہن دے دیتا۔

"نہیں" ــــ رابعہ نے کہا ــــ "آپ نے مجھے قبول کر کے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ میں آپ سے اور کوئی قربانی نہیں لوں گی۔"

تیسرے چوتھے دن رابعہ نے مجھے ایسی بات بتائی جسے میں نے سچ نہ سمجھا۔ اُس نے کہا کہ میری بہن صدیق کے ساتھ شادی کرنے کے لئے تیار ہے۔ میں نے خود اپنی بہن سے پوچھا۔ اُس نے سر ہلا کر تائید کی اور سر جھکا لیا۔ ہم اُس کلاس کے لوگ ہیں جس میں بھائی اپنی بہنوں کے ساتھ اُن کی شادی کے متعلق بے تکلفی سے باتیں نہیں کیا کرتے۔ مجھے ساری بات رابعہ نے سنائی تھی۔

میری بہن نے رابعہ کو بتایا کہ صدیق کبھی کبھی اُس کے پاس بیٹھا کرتا اور بڑی اچھی باتیں کیا کرتا تھا۔ بعض اوقات اُس کے آنسو نکل آتے تھے۔ میری بہن کے دل میں صدیق کی ہمدردی پیدا ہو گئی۔

"صدیق کو ساری دنیا پاگل کہتی رہے، میں اُسے پاگل نہیں سمجھتی" ــــ میری بہن نے رابعہ کو بتایا ــــ "وہ میرے پاس بیٹھتا ہے تو بالکل صحیح باتیں کرتا ہے۔ وہ مجھے اچھا لگتا ہے۔"

"صدیق!" ــــ ایک روز میں نے اُسے پاس بٹھا کر پوچھا ــــ "تم میری بہن کے ساتھ شادی کرنا چاہتے ہو؟"

وہ میرے مُنہ کی طرف دیکھنے لگا لیکن مُنہ سے کچھ نہ بولا۔ میں نے پہلی بار اُس کے چہرے پر سنجیدگی دیکھی۔

"اگر تم اپنے آپ کو ٹھیک سمجھتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں" ــــ میں نے کہا۔

وہ چُپ رہا۔ میں نے اُس سے تین چار بار پوچھا تو اُس نے سر اُٹھایا۔

"آپ اپنی بہن پر زبردستی تو نہیں کر رہے؟" ــــ اُس نے پوچھا۔

"نہیں" ــــ میں نے جواب دیا۔

"پھر آپ سوچ لیں" ——اُس نے کہا۔

میں نے سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا اور صدیق کی شادی اپنی بہن کے ساتھ کر دی۔ یہ ایک خطرہ تھا جو میں نے مول لیا۔ خدا نے مجھے، رابعہ اور میری بہن کو امتحان میں نہ ڈالا۔ صدیق بڑی تیزی سے بدلنے لگا اور تین مہینوں میں وہ بالکل ہی بدل گیا۔ دس سال گزر گئے ہیں۔ وہ دو بچوں کا باپ ہے اور بڑی خوشگوار زندگی گزار رہا ہے۔

سُرورِ جاوداں

اپنے لڑکپن کا ایک سچا واقعہ نذرِ قارئین کرنے سے پہلے اتنی گذارش ضروری سمجھتا ہوں کہ میں ایک حقیر و پُرتقصیر بندہ ہوں اور میرا شمار بالکل عام قسم کے انسانوں کے زُمرے میں ہوتا ہے۔ میں خود کو اللہ کی برگزیدہ اور پاکباز ہستیوں کی خاکِ پا کے برابر بھی نہیں سمجھتا۔ شاید میں الفاظ میں اپنے واقعہ کی صحیح توضیح نہ کر سکوں مگر خدا شاہد ہے یہ واقعہ بلعینہٖ مبنی بر حقیقت ہے اور اسے اپنے ضمیر کی روشنی میں قلم بند کرتے ہوئے میں اس کے جھوٹ اور سچ کا ذمہ دار ہوں۔

یہ جون یا جولائی کی ایک حد درجہ تپتی ہوئی دوپہر کا واقعہ ہے۔ میری عمر اُس وقت تیرہ چودہ سال کے درمیان ہوگی۔ اُس دن گھر میں کھانا پکانے کے لئے ایندھن نہیں تھا اور ہمیں لکڑیاں لانے کے لئے جنگل میں بہت دُور جانا پڑتا تھا۔ دیہات میں ایسے ہی ہوتا تھا۔ میں نے رسّی اور پگڑی سنبھالی اور امی کے منع کرنے کے باوجود اکیلا ہی نکل گیا۔

اپنے گاؤں کے مغرب کے رُخ چند فرلانگ سے پہاڑی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ عمودی چٹانوں کی ایک نیچی سی دیوار جوں جوں مغرب کی سمت بڑھتی ہے، اس کی اونچائی میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس اونچی نیچی دیوار کے متوازی ایک ٹوٹا پھوٹا، سنگلاخ، تنگ اور خاردار راستہ میلوں کی مسافت تک طویل ہے۔ راستے کی بائیں سمت ڈھلوان ہے جس کے نصف میل نیچے پانچ چھ میل شرقاً غرباً پھیلی ہوئی ایک تنگ سی وادی ہے۔ اس کے مشرق کے سرے پر ہمارے علاقے کا معروف قصبہ ڈھلوال ہے جسے علاقے کے تقریباً بیس دیہات میں صدر مقام کی حیثیت حاصل ہے۔ وادی کے اختتام پر مغرب کی طرف ایک

بلند اور مسطح پہاڑی پر پاک و ہند کے نامور پائیلٹ ایم۔کے جنجوعہ مرحوم کا گاؤں ملوٹ واقع ہے۔ جب پاکستان معرضِ وجود میں آیا اُس وقت جنجوعہ مرحوم ایئر کموڈور تھے۔

گاؤں سے کوئی دو میل کی دُوری پر پہنچتے پہنچتے دن کے تقریباً دس بجے کا وقت ہو گیا تھا۔ جس مقام پر پہنچ کر میں نے لکڑیاں چُن چُن کر ایک ہموار جگہ اکٹھی کرنی شروع کی تھیں، ہم اُسے ڈخیر یا ڈھکیر کہتے ہیں۔ مجھ پر اُس دن پڑنے والی افتاد اور بپتا کا اصل آغاز یہیں سے ہوتا ہے۔

سورج کا آگ برساتا ہوا گولہ رفتہ رفتہ بلند ہو کر نصف النہار پر آ رہا تھا۔ اُس کی آتشیں شعاعوں کے تیر مسلسل سینۂ زمین پر پیوست ہو رہے تھے۔ دھوپ کی تمازت میں ہر لحظہ اضافہ ہو رہا تھا۔ ہر طرف بکھری ہوئی بڑی بڑی چٹانیں دہکتے ہوئے الاؤ میں بدل چکی تھیں۔ ہوا بالکل بند تھی۔ فضا میں بلا کا حبس تھا۔ موسم کی قہرمانی طاقت پوری آب و تاب سے غیظ و غضب کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ وہاں چند مویشیوں کے علاوہ دُور دُور تک کسی اور ذی رُوح کا پتہ نہ تھا۔ یہ مویشی موسم کی مار سے گھبرا کر خاردار جھاڑیوں میں گھس کر پناہ لینے کی سعی کر رہے تھے۔ پانی کی دستیابی کا تو وہاں تصور بھی نہ تھا۔ آج تو اُس سلسلۂ کوہ میں میلوں دُور تک کوئلے کی کانیں بکھری ہوئی ہیں۔ جس زمانے سے میرے واقعے کا تعلق ہے، اُس وقت وہاں کچھ بھی نہ تھا۔

اس قیامت خیز گرمی میں دوڑ دوڑ کر لکڑیاں چلنے سے میری حالت نہایت بُری ہونے لگی تھی۔ کھوپڑی چٹخ رہی تھی۔ شدتِ پیاس سے ہونٹ تڑخنے لگے۔ مُنہ سے لے کر حلقوم تک زبان پر جیسے کانٹے اُگ آتے تھے۔ جسم کی نمی پسینے کی صورت میں خارج ہو رہی تھی۔ امی سے ضد کر کے تنہا گھر سے اتنی دُور آنے پر مجھے اپنی حماقت کا اب سخت افسوس ہو رہا تھا۔ میں نے رسی بچھائی اور جمع کی ہوئی لکڑیوں کو باندھ کر گٹھا بنایا اور جسم و جان کی رہی سہی قوت کو بروئے کار لا کر گٹھے کو بمشکل تمام سر پر رکھنے میں کامیاب ہو سکا۔

اس دشتِ بلا سے گھر لوٹتے ہوئے مجھے یوں لگ رہا تھا، جیسے کسی

جہنم زار کو عبور کرنے پر مجبور ہوں۔ پتھر کے روڑے میرے گھسٹتے ہوتے پیروں سے ٹکرا ٹکرا کر میری سست روی میں حارج ہو رہے تھے۔ میں کسی بھی وقت منہ کے بل زمین بوس ہو سکتا تھا۔ چیونٹی کی چال چلتے ہوتے نصف سے کچھ زائد راستہ طے کر کے اُس مقام پر پہنچا جہاں عین سیدھ پر نیچے وادی میں پانی چمک رہا تھا۔ میں نے حسرتناک آنکھوں سے پانی کی طرف دیکھا اور دل مسوس کر رہ گیا۔ وادی کے اُس مقام کو ہم جُنڈ کہتے ہیں جہاں ٹھنڈے اور میٹھے پانی کا ایک چھوٹا سا چشمہ ہے اور آتے جاتے راہگیر وہاں سے پانی پیتے ہیں۔ چشمے کا فاضل پانی بہہ کر ایک گڑھے میں جمع ہوتا رہتا ہے جو جانوروں کی پیاس بجھانے کے کام آتا ہے۔

جی میں آئی کہ لکڑیوں کا گٹھا دہیں رکھ کر نیچے چشمے پر جا کر پانی پی آؤں مگر سوچا کہ منزلِ مقصود چشمے کی مسافت کے مقابلے میں کچھ زیادہ دُور نہیں اور اگر سفر جاری رکھوں تو چشمے پر پہنچنے کی دیر میں گاؤں کے نزدیک پہنچ جاؤں گا۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ اب مجھے اپنی ہلاکت یقینی نظر آ رہی تھی۔ کانوں میں سیٹیاں سی بج رہی تھیں۔ آنکھوں کی چمک بتدریج معدوم ہوتی جا رہی تھی۔ رُوح ہونٹوں کی طرف سمٹ رہی تھی۔ میں نے جی کڑا کر کے بدقت تمام قدم اُٹھایا ہی تھا کہ اچانک میری دھندلاتی ہوئی نگاہیں وادی کی جانب گئیں۔ ڈھلوان کی سمت سے دو مال بردار اونٹ نمودار ہوتے جو ملوٹ کی طرف جا رہے تھے۔ اگلے اونٹ کی مہار ساربان نے کاندھے پر رکھی ہوئی تھی اور اُونٹ اس کے پیچھے چل رہے تھے۔ چشمہ ابھی بیس پچیس گز دُور تھا کہ اُونٹوں کو پانی کی جھلک دکھائی اور وہ بے تاب ہو کر ساربان کے ایک طرف سے ہو کر بے تحاشا دوڑنے لگے اور پانی کے گڑھے پر پہنچ کر اپنے مُنہ بے تابانہ پانی کی چمکتی ہوئی سطح پر رکھ دیتے۔ اُونٹوں کی یہ انتہائی اشتہا خیز اور بے ساختہ حرکت میرے پیمانۂ صبر و ضبط کے لئے تازیانہ ثابت ہوئی۔ میری آتشِ پیاس کا شعلہ کسی بے تیل چراغ کی مانند آخری بار بھڑکا۔ میری بیکلی حد سے تجاوز کر گئی۔ میرے بے سکت ہاتھوں کی گرفت سر پر رکھی ہوئی لکڑیوں پر سے ڈھیلی پڑ گئی۔ میری آنکھوں کے آگے مکمل تاریکی کے پردے حائل ہو چکے تھے۔ میں لہرایا، تھرایا اور بیہوش ہو کر ایک بڑے سے پتھر پر

گر پڑا۔ گرنے سے قبل صرف اتنا یاد رہا تھا کہ میرے سُوکھے ہوئے ہونٹوں سے "م ..... ماں" نکلا تھا۔

ماں! — کس قدر شیریں، انگبیں اور کیف زا نام ہے۔ مبدأ الفیض کے دستِ تخلیق کار نے ماں جیسی شہکار ہستی کو مجسم صورت میں ڈھالتے وقت اُس کے خمیر میں وفا، مروّت، ایثار، قربانی، محبت اور پیار کا بافراط عنصر سمو دیا ہے۔ اس کی پُر خلوص اور بے لوث چاہت کسی بدلے اور صلے کی متقاضی نہیں ہوتی اور اولاد اُس کے ہونٹوں کی حیات افروز اور لازوال مسکراہٹ ہوتی ہے۔

ماں کہہ کر جب میں بیہوشی کی اتھاہ میں اُتر رہا تھا تو جواب میں کانوں میں امّی کی مانوس اور پیار بھری آواز قلب رُوح کی گہرائیوں میں اترتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اُن کی سانس پھولی ہوئی تھی، اور انہوں نے مجھے — "آتی .... آتی میرے لال آتی" — کہتے ہوئے اپنے گداز بازوؤں کے حصار میں بھر لیا تھا اور میں اُس تپتے ہوئے پتھر پر نہیں بلکہ ایک مخملیں فرش پر بیٹھا ہُوا تھا۔ ماں نے مجھے اپنی نرم و گداز آغوش میں لے کر ایک ناقابل بیان حد تک سرور انگیز اور ٹھنڈے شربت کا جام میرے مُنہ سے لگا رکھا تھا۔

بیہوشی سے ہوش میں آنے تک شاید کوئی بھی آدمی ہوش اور بیہوشی کے درمیانی وقفے کا صحیح تعین نہیں کر سکتا کہ اس کا رشتہ کتنی دیر زندگی کے ہنگاموں سے منقطع رہا مگر مجھے اس کا اندازہ ہو چکا تھا۔ میرے سامنے قدرت کی کریمانہ کرشمہ سازی کا کھیل لمحوں کے اندر آغاز و انجام کا مرحلہ طے کر گیا تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد جب میری آنکھ کھلی تو سب سے پہلے سورج سے آنکھیں چار ہوئیں جو عین سر کے اُوپر مجھے شعلہ بار نگاہوں سے گھور رہا تھا۔ میں نے سہم کر دوبارہ آنکھیں بند کر لیں اور ماں کی ریشمیں آغوش میں سما جانے کی کوشش کرنے لگا مگر اب یہ ممکن نہ تھا۔ کاش! وہ چند حاصلِ زیست اور ناقابلِ فراموش لمحے وقت کے کارواں کے ساتھ چلنے کی بجاتے یہیں ساکت ہو جاتے۔

پتھر کی ناقابل برداشت تپش نے فی الفور مجھے خواب اور حقیقت کے فرق کا احساس دلا دیا تھا اور میں ایک دم سیدھا کھڑا ہو گیا۔ میں نے متوحش ہو کر دیکھا۔ ماحول جُوں کا تُوں نمونۂ دوزخ بنا ہُوا تھا پھر وادی کی طرف

دیکھا۔ اونٹوں نے ابھی ابھی پانی پینے کے بعد گردنیں سیدھی کی تھیں اور اب وہ سروں کو جھٹک کر تھوتھنیوں سے پانی کے قطرے جھاڑ رہے تھے۔

میں نے اپنے سراپا کا جائزہ لیا۔ میرا لباس سر تا پیر پسینے میں یوں شرابور تھا جیسے کسی نے ابھی ابھی مجھے تالاب میں غوطہ دے کر نکالا ہو۔ میرے جسم میں توانائی دوبارہ یوں بھرپور طور پر عود کر آئی تھی کہ زندگی میں پیشتر ازیں کبھی اس سے لذت یاب نہیں ہوا تھا۔ میرے جھلسے ہوتے جسم و جاں پر ابرِ رحمت برس کر گزر چکا تھا۔ پیاس کا نام و نشان تک نہ تھا۔ میرے سوختہ لب پھول کی شبنم آلود پنکھڑیوں کی طرح تر و تازہ ہو چکے تھے۔ مُنہ سے لے کر حلق تک عالمِ غنودگی میں ماں کے پلاتے ہوتے جامِ شیریں کی مٹھاس اور شیرینی ابھی تک تازہ تھی۔

لکڑیوں کا گٹھا لڑھک کر چند گز نیچے ایک جھاڑی میں اٹکا ہوا تھا۔ میں نے تشکر آمیز اور اشک آلود نگاہوں سے آسمان کی طرف دیکھا اور لکڑیاں سر پر رکھ کر گھر کی طرف چل دیا۔ راستے میں لُو کا کوئی ہلکا پھلکا جھونکا میرے بھیگے ہوتے کپڑوں سے ٹکرا کر مجھے فرحت و انبساط میں مخمور کر جاتا تھا۔

ہمارے گاؤں سے ذرا فاصلے پر مغرب کی سمت بابا مقیم شاہؒ کا مزار ہے۔ میں نے دُور سے دیکھا، مزار کے نزدیک پھلاہی کے ایک درخت کے نیچے میری دو بہنیں (ایک مجھ سے بڑی اور دوسری چھوٹی) بیٹھی میری راہ تک رہی تھیں۔ ان کے پاس ایک برتن رکھا ہوا تھا۔ میں قریب پہنچا تو اُن کے چہرے خوشی سے چمک اُٹھے اور وہ اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

"تم نے بہت دیر لگا دی"—— بڑی بہن نے آگے بڑھ کر کہا—— "ہم سخت فکرمند تھے۔ لو یہ گٹھا مجھے دے دو اور تم پانی پی لو۔"

"مجھے پیاس نہیں"—— میں نے مسکرا کر جواب دیا—— "یہ پانی تم دونوں پی لو اور گھر چلو۔"

"پیاس نہیں؟"—— بہنوں نے متعجب ہو کر کہا اور پھر میرے چہرے پر بشاشت دیکھ کر مطمئن ہو کر میرے ساتھ چلنے لگیں۔

راستے میں بڑی بہن نے مجھے یہ حیران کن بات بتائی کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے جب امی سو رہی تھیں تو انہوں نے کوئی بڑا ہی ڈراؤنا خواب دیکھا۔ وہ خواب میں زور زور سے چلّانے لگیں ——"آئی، میں آئی"—— پھر ہڑبڑا کر چارپائی پر اُٹھ بیٹھی تھیں۔ وہ خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھیں اور پسینہ پسینہ ہو رہی تھیں، پھر انہوں نے ہم سے کہا کہ باہر جا کر بھائی کو دیکھو۔ اُس نے دیر کر دی ہے اور ہم اِدھر آتے ہوتے پانی بھی ساتھ لیتی آئیں۔

میں نے گھر پہنچ کر لکڑیاں صحن میں پھینکیں اور جونہی کمرے میں داخل ہُوا، امّی سراپا اضطراب بن کر میری جانب لپکیں۔ اُن کی ممتا کی آنکھوں میں مجھے شفقت، پیار اور بے چینی کا ایک ایسا دریا موجزن نظر آیا کہ پہلے ایسا کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اُنہوں نے مجھے سینے کے ساتھ بھینچ لیا تھا۔ میں نے انتہائی عقیدت، مسرت اور حسرت سے بغور اُن کا چہرہ دیکھ کر کہنے کی کوشش کی تھی "امّی جان، آپ ....آپ ...."

اُن کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز تبسم پھیل گیا ——"ہاں بیٹا"—— اور پھر اپنے ہونٹ میری عرق آلود پیشانی پر رکھتے ہوتے صرف اس قدر کہا تھا ——"بہت دُور نہ جایا کرو بیٹا!"

میں بیہوشی میں اور امّی عالمِ رؤیا میں ہم دونوں یکساں جس حیرت انگیز کیفیت سے گزر رہے تھے، یہاں آمنا سامنا ہو لے پر ہمیں اپنے احساسات کی ترجمانی کے لئے قوتِ گویائی اور الفاظ کا سہارا لینے کی ضرورت نہ تھی۔ اُس وقت میرا ننھا سا ذہن کشش و کشف کے اس معمّے کو حل کرنے سے قاصر تھا۔

امّی جان نے مجھے کھانا دیا اور یقین کیجئے کہ کھانے کے دوران بھی میں نے فقط نوالا نگلنے کے لئے پانی استعمال کیا تھا ورنہ اس کی احتیاج نہ تھی۔

میں نے آگے چل کر زندگی میں وقتاً فوقتاً مختلف النوع ذائقوں کے مشروبات پیتے مگر وہ آبِ شیریں جو قدرت کے توسط سے مجھے امّی جان نے پردۂ اخفا میں پلایا تھا، میں اُس کی لطافت، اُس کی مہک اور سُرور کو کبھی فراموش نہ کر سکوں گا۔